قریشی صاحب قابل ستایش ہیں کہ وہ انھیں زاویۂ عزلت سے نکال کر منصۂ شہود پر لے آئے، شروع کتاب میں قریشی صاحب نے ایک گرانقدر مقدمہ لکھا ہے، جس میں عزلت کے خاندان، ان کے ذاتی حالات اور خصوصیات شعری پر بحث اور جا بجا تذکرہ نگاروں کے بعض بیانات کی تردید کی ہے، اور صحیح واقعات کو سامنے لائے ہیں،

مرزا مظہر جان جاناں کے بعد قریشی صاحب کی یہ دوسری قیمتی ادبی خدمت ہے۔ اس مختصر تبصرہ سے کتاب کا حق ادا نہیں ہوتا، مگر لائق مرتب ایک مشہور صاحب قلم ہیں، اور علمی طبقہ ان کی علمی و ادبی حیثیت سے واقف ہے اس لیے یہ مختصر ریویو اس کتاب کی خوبیوں کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے،

دیوان حافظ مترجم - مترجم مولانا قاضی سجاد حسین صاحب، صفحات ۴۴۲، کتابت وطباعت عمدہ، مع گرد پوش، ناشر سب رس کتاب گھر، دہلی۔ قیمت ؏ مجلد عـہ،

حافظ کو مولانا جامی نے لسان الغیب کا لقب دیا تھا، اور صحیح دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے سفینۂ غزل کو اہل دل اور اہل عقل دونوں نے ہمیشہ اپنا وظیفۂ محبت بنائے رکھا، اور ان کے مجازی استعاروں اور کنایوں کو بھی حقیقت کے اسرار و رموز سمجھا گیا، سعدی کی گلستاں و بوستاں کے علاوہ شاید ہی کسی کی کتاب کو ہند و ایران میں اتنا حسن قبول حاصل ہوا ہو، آج سے ۴۰-۵۰ برس پہلے تو ایسے شخص کو جس نے دیوان حافظ کا مطالعہ نہ کیا ہو، مشکل ہی سے پڑھا لکھا آدمی سمجھا جا سکتا تھا، عوام تو عوام بعض خواص تک اس سے فال نکالتے تھے،

اب چونکہ فارسی کا مذاق کم ہو گیا ہے، اس لیے مولانا سجاد حسین صاحب نے اس کا سلیس اردو ترجمہ کر دیا ہے، اور ضروری تلمیحات کی تشریح بھی کر دی ہے، اس ترجمہ سے کم غیر فارسی داں طبقہ اس سے مستفیض ہو سکے گا، اس کی طباعت و اشاعت میں سب رس کتاب گھر نے بڑی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے،

"م، ج"

جلد ۹۲۔ رجب المرجب ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۳ء۔ عدد ۶

مضامین

شذرات

امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر کنیڈی کا قتل بہت بڑا بین الاقوامی حادثہ ہے جس کا اثر پوری دنیا کی سیاست پر پڑیگا، وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، ابھی انکی عمر ۴۶ سال کی تھی، اور انکی مدت صدارت بھی ڈھائی سال سے زیادہ نہ تھی، اس عمر اور اس مدت میں بین الاقوامی معاملات میں انھوں نے جس تدبر اور ہوشمندی کا ثبوت دیا وہ انکی سیاسی بصیرت اور عالی دماغی کی بین شہادت ہے، وہ مختلف رنگ و نسل کی قوموں کے درمیان مساوات، دوستانہ تعلقات اور امن کے بڑے علمبردار تھے، اور اس راہ میں انکے بڑے کارنامے ہیں، وہ نسلی تفریق و امتیاز کے سخت خلاف تھے، اور اس میں انھوں نے اپنی قوم کی بھی مخالفت کی پرواہ نہیں کی اور نیگرو اور یورپین نژاد امریکیوں کے درمیان حقوق کے مساوات کی کوشش کے جرم میں قتل کیے گئے، اس لیے ان کا قتل درحقیقت انسانیت کی راہ کی قربانی ہے، مذہبی حیثیت سے بھی وہ قابل قدر تھے، وہ راسخ العقیدہ کیتھلک تھے، پروٹسٹنٹ میں تو برائے نام مذہب رہ گیا ہو، گو رومن کیتھلک کی بعض رسمیں مشرکانہ ہیں لیکن یورپ و امریکہ کی خدا بیزار اور مادہ پرست سرزمین میں مذہب انہی کے دم سے زندہ ہے،

افسوس ہو کہ ایک طویل علالت کے بعد گذشتہ مہینہ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی نے وفات پائی، مرحوم ایک ممتاز عالم دین، خوش بیان واعظ اور عملی انسان تھے، انھوں نے مسلمانوں کی بڑی مفید علمی، تعلیمی اور ملی خدمات انجام دیں، وہ سیاسی خیالات میں قوم پرور تھے، اور ان کا اتنا اثر تھا کہ لیگ اور کانگریس کے اختلافات کے شباب کے زمانہ میں اسمبلی کے انتخاب میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ٹکٹ پر لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں کامیاب اور شعبۂ تعلیم میں پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہوئے، لیکن وہ ایک دیندار اور باحمیت مسلمان تھے، اس لیے زیادہ دنوں تک حکومت کے ساتھ نہ چل سکے، اور ایک مذہبی معاملہ میں ان کو اس عہدے سے الگ ہونا پڑا، درس و تدریس سے بھی انکو ذوق تھا، نور العلوم کے نام سے انھوں نے بہرائچ میں عربی کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، نئے نظام تعلیم میں ان کو مسلمان بچوں کی تعلیمی مشکلات کا ذاتی تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدہ سے الگ ہونے کے بعد وہ ہمہ تن مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی جد و جہد میں لگ گئے، اور درس قرآن کا ایک سلسلہ مرتب کیا، جس سے بیک وقت ابتدائی عربی، ترجمۂ قرآن اور اردو زبان تینوں کی تعلیم ہو جاتی تھی، یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا، اور مولانا نے اسکی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہندوستان بھر کا دورہ کیا، اس غیر معمولی محنت سے ان کی صحت خراب ہو گئی اور ان پر فالج کا حملہ ہو گیا، اور سات آٹھ سال صاحب فراش رہنے کے بعد ۲۰ نومبر کو انتقال کیا، اللہ تعالیٰ انکے خدمات کو قبول اور ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

اسکا ذکر ان صفحات میں بارہا آچکا ہے کہ جدید تمدن نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت سے ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کا وجود ہماری فقہ میں نہیں ہے، اور جن کے حل کے بغیر زندگی کے کاروبار میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں بعض پرانے فقہی مسائل پر بھی نئے حالات کی روشنی میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے، اس کا احساس عرصہ سے علماء کو تھا، اس کی ابتدائی کوشش بھی ہوئیں لیکن یہ کام آگے نہ بڑھ سکا، گذشتہ دنوں جب مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مسئلہ اٹھا تو اس کی ضرورت اور بھی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی، چنانچہ گذشتہ یکم ستمبر کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں مختلف الخیال علماء کا ایک اجتماع کیا، ان کے مشورے سے "مجلس تحقیقات شرعیہ" کے نام سے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا ہے جس کے ارکان میں مختلف مکاتب فکر کے علماء شامل ہیں، اور اس کام کے لیے مولانا محمد تقی صاحب امینی کا تقرر ہوا ہے جن کی فقہی وسعت نظر سے اہل علم پوری طرح واقف ہیں، اور سر دست روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل

کی ایک فہرست بھی مرتب کر لی گئی ہے، مولانا امینی اصحاب فقہ و فتاوی علما کی رائے اور مشورے سے ان مسائل کا حل تلاش کریں گے، اس مجلس کے قیام کی مختصر روداد اخبارات میں چھپ چکی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مجلس نے جس کام کی ذمہ داری لی ہے وہ بڑا کٹھن ہے، اور اسکی راہ میں بڑے سخت مراحل اور بڑی پیچیدہ اور دشوار گذار گھاٹیاں ہیں ان مسائل کا ایسا حل نکالنا آسان نہیں ہے، جن سے موجودہ مشکلات بھی دور ہو جائیں اور کسی کو اس سے اختلاف بھی نہ ہو، مگر اس سے کم سے کم یہ فائدہ تو ضرور حاصل ہوگا کہ ضروری اور کثیر الوقوع معاملات و مسائل کے تمام فقہی پہلو، ان کے بارہ میں مختلف مذاہب کے ائمہ کے مسلک، اور موجودہ علما کی رائیں سامنے آجائیں گی جس سے موجودہ تنگ دائرے میں وسعت پیدا ہوگی، اور اندھیرے میں ایک راہ نظر آجائے گی، یہ وقت کی ایک بڑی اہم ضرورت ہے، اس لیے امید ہے کہ ہندوستان کے اصحاب فقہ و فتاوی علما اپنے قیمتی مشوروں سے مجلس مذکور کی پوری مدد کریں گے۔

ترکی میں جو مذہبی بیداری پیدا ہوئی ہے، اس کی اجمالی خبریں اخبارات سے معلوم ہوتی رہتی ہیں، ابھی حال میں ہمارے پاس عربی اور انگریزی میں ایک پمفلٹ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ استنبول میں "المعهد الاسلامی العالی" کے نام سے اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم یا اسلامک اسٹڈیز کی ایک بلند پایہ درسگاہ قائم ہوئی ہے، یہ پمفلٹ اس کا اجمالی خاکہ ہے، اس کے نصاب میں جملہ دینی علوم کے ساتھ وہ فنون بھی ہیں جو اسلامیات میں مہارت اور اسلامی علوم و مسائل پر کام کرنے کے لیے اس زمانہ میں ضروری ہیں، اس پرچہ میں اس کی تلخیص دیجا رہی ہے، اس سے اس کی تفصیل معلوم ہوگی،

مقالات

جمع و تدوینِ قرآن

از جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم

(۳)

یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر قرآن مربوط اور منضبط تھا تو پھر حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت "فاجمعہ" کے کیا معنی ہیں؟ یہ اعتراض برمحل بھی ہے اور وزنی بھی۔ اس کے جواب کا ایک رخ تو یہ ہے کہ یہ روایت جو زہری کی ہے غیر معتبر ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو غیر معتبر ہونے کے جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کو بیک نظر مسترد کر دیا جائے اس روایت کی سند وغیرہ پر تو بعد میں غور کیا جائیگا، فی الحال یہ مان لیجئے کہ یہ روایت صحیح ہے، ورنہ بخاری جیسا ناقد حدیث اس کو اپنی کتاب میں جگہ کیوں دیتا، تب بھی کوئی بات اس حکم میں سمجھ سے باہر نہیں، مشکل ضرور ہے،

پھر اس اصول کا سہارا لیجئے، جسے میں نے اوپر عرض کیا ہے، کیفیت یہ ہے کہ آٹھ دس صحابہ کے پاس لکھے ہوئے مدون، مرتب اور مکمل قرآن موجود ہیں، مگر ان نسخوں پر کوئی تصدیق نہیں، یعنی کسی نے اس کی توثیق نہیں کی، آجکل کی دفتری زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ کوئی "سرٹیفائڈ کاپی" اس مصحف کی نہیں ہے،

آپ غور کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا نہ جانتے تھے، جتنے دعوت نامے آپ نے لوگوں

کو بھیجے گئے وہ دوسرے لوگ لکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر مہر لگا دیتے تھے، صلحنامہ حدیبیہ لکھا دوسروں نے، اس کی توثیق اور تصدیق آپؐ نے کی، یمن کے حاکم کو ہدایت نامہ بھیجا گیا توسر معاذؓ آپ نے فرمایا کہ یہ ہدایت ٹھیک ہے، تو پھر اگر قرآن کے کسی نسخے پر آنحضرتؐ کی مہر کا مطالبہ کیا جاتا یا اب کیا جائے تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے،

یہ مانا کہ آنحضرتؐ کے وصال کے وقت قرآن مجید کے ایک درجن لکھے ہوئے نسخے موجود تھے، مگر ان میں کسی پر مہر نہیں تھی کہ یہ نسخہ آنحضرتؐ کا دیکھا ہوا ہے،

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بڑی جماعت کے پاس قرآن مجید کے کچھ حصے ہیں، جو ان کو یاد ہیں محفوظ ہیں، کچھ کے پاس لکھے ہوئے حصے ہیں، پتھر پر لکھے ہوئے، ہڈیوں پر لکھے ہوئے، رقاع پر لکھے ہوئے، مگر یہ لکھے ہوئے حصے ایسے ہیں جو بیک وقت نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ان میں بھی ممکن ہے کہ ایک حصہ دوسرے سے مختلف ہو۔

شاید یہ بات ناگوار معلوم ہو کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ ایک لمحہ کے لیے تحمل سے کام لیں اور اس پر غور کریں کہ آیات کی ترتیب نزول کے وقت بحکم خداوندی متعین ہوتی تھی تو آپ اس نتیجے پر متفق ہوں گے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے:

اس کی بہت واضح مثال سورۂ بقرہ کی دو سو اسی[۲۸۰] آیت والی حدیث سے ملتی ہے، سورۂ بقرہ مدنی ہے، یہ آیت مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوئی، اب فرض کیجیے کہ زید کے پاس سورۂ بقرہ اس آیت کے نزول سے کچھ دن پہلے کی لکھی ہوئی تھی اور بکر کے پاس اس کے نزول کے بعد کی تو دونوں ٹکڑوں میں اختلاف ہوگا۔

پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ قرآن کے معاملہ میں صحابہ کرام جس احتیاط کو لازم سمجھتے تھے، اس کی ایک مثال آج تک کتب احادیث میں موجود ہے، حضرت عمرؓ جیسا جلیل القدر صحابی زید بن ثابتؓ

کو یہ آیت سناتا ہے:

من المهاجرين والانصار الذين اتبعوهم باحسان

زیدؓ کہتے ہیں کہ مجھے تو یہ آیت جس طرح یاد ہے اور (قیاساً)، جیسا کہ میرے پاس لکھی ہوئی بھی موجود ہے، اس میں انصار اور الذین کے درمیان ایک "واؤ" بھی ہے، اب تحقیق شروع ہوتی ہے، اور جب شہادت زیدؓ کے موافق مل جاتی ہے تو مصحف میں آیت اسی طرح لکھی جاتی ہے، جس کتاب کا نسخہ تیار کرنے میں اتنی احتیاط برتی جائے اور جو طبائع اس احتیاط کو لازمی سمجھتے ہوں وہ کیونکر اس پر مطمئن ہو سکتے تھے کہ صرف زیدؓ یا اور آٹھ دس حضرات کے پاس جو نسخے ہیں اور جو بہر کیف مصدقہ نہیں ہیں، وہ اس بات کی مسلمہ شہادت ہو سکتے ہیں کہ یہ مصاحف یا ان میں سے کوئی ایک بعینہٖ وہی ہے جس کو حضور اکرمؐ نے اخیر وقت میں مکمل کرایا تھا، اور یہ بھی نہ بھولیے کہ بہت سے مسلمانوں کے پاس ایسے لکھے ہوئے ٹکڑے کلام مجید کے محفوظ تھے، جو آخری نسخہ سے مختلف تھے، ان مرتب شدہ مصاحف اور ان ٹکڑوں میں اختلاف باعث انتشار ہو سکتا تھا خصوصاً اس وقت جبکہ وہ بزرگ ہستیاں جن کو حضور انورؐ نے قرآن پڑھانے کی اجازت دی تھی، اس دنیا میں نہ رہ جائیں۔

اگر ان حالات میں کسی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر قرآن کا ایک مصدقہ نسخہ جمع نہ کر لیا گیا تو "کثیر من القرآن" کا "ذہاب" ہو جائے گا، تو یہ خدشہ بالکل فطری تھا، اور اگر خلیفۂ وقت سے یہ استدعا کی گئی کہ آپ بحیثیت خلیفۂ اسلام کے اس مہم کو ہاتھ میں لیں اور ایک نسخہ ایسا لکھوائیں جس کے اوپر آپ کی مہر تصدیق ثبت ہو تو یہ کونسا گناہ تھا، اور اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ قرآن مرتب نہ تھا یا کم از کم اس کی سورتیں ایک مربوط انداز سے جمع نہ تھیں۔

ان حالات میں جو خلیفۂ وقت تھا اس کا کیا رویہ ہونا چاہیے تھا۔

ایک تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے حکم سے یہ فیصلہ کر دیتا کہ زید کا جو مصحف ہے وہی صحیح مصحف ہے،

سب لوگ اس کی پابندی کریں، یہ طریقہ کار بہت سہل اور تمام آمرانہ کاموں کی طرح جھگڑوں سے پاک ضرور ہوتا مگر اس جمہوری روح کے منافی ہوتا جس کا دوامی پیغام لیکر اسلام آیا تھا،

اس کے علاوہ اگر ایسا کیا جاتا تو بکر جس کے پاس زید کے مصحف سے مختلف لکھا ہوا کوئی ٹکڑا ہوتا اس کو کیسے مطمئن کیا جا سکتا کہ اس کا لکھا ہوا مصحف نامکمل ہے، یا درست نہیں ہے، اور بکر کو یہ کہنے کا حق باقی رہتا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی ایک نسخہ کی تصدیق کرنے سے پہلے لوگوں کو اس بات کا موقعہ ہی نہیں دیا کہ ان کے پاس جو ذخیرہ قرآن مجید کا ہے لے وہ آپکے سامنے پیش کر سکیں اور حضرت ابوبکرؓ اس کی خامیاں ظاہر کرکے اس کو مطمئن کر سکیں کہ اس کا نسخہ نامکمل ہے، اور ہر غیر جانبدار منصف مزاج اس کی تائید کرتا،

یہی وجہ ہے کہ جب یہ پالیسی طے کر لی گئی کہ قرآن کا ایک مستند نسخہ خلیفہ کے لیے لکھکر جمع (فراہم) کر دیا جائے تو حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں اعلان فرمایا کہ جس کے پاس قرآن کا جو ٹکڑا بھی موجود ہو وہ لے آئے اور زید کے سامنے پیش کرے،

یہی طریقہ حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کیا، آپ نے ایک نوجوان اور عاقل کاتب وحی کو جس نے عرضۂ اخیرہ میں خود نبی اکرمؐ کی زبانی قرآن سنا تھا، جس نے اپنا لکھا ہوا قرآن آنحضرتؐ کو سنایا تھا، اسی کام پر متعین کیا کہ وہ ایسا نسخہ تیار کرے، اور اعلان کیا کہ جس کسی کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو یا زبانی یاد ہو وہ اس کو "جامع" قرآن کے سامنے لاکر پیش کرے، اور اس جامع قرآن کا فرض ہوگا کہ وہ اس پیش کردہ حصے کی صحت پر پہلے اس کی دو شہادتیں لیں کہ یہ حصہ بعینہ اسی ترتیب سے ہے جس طرح حضور اکرمؐ سے سنا گیا، اور جب یہ بات متعین ہو جائے تو پھر اسے اپنے نسخے سے مقابلہ کرکے مستند نسخہ میں لکھ دے،

ظاہر ہے کہ یہ کام بڑی ذمہ داری کا تھا، اور کوئی شخص بھی جسے اپنے فرض منصبی کا احساس ہو

اس کی ہامی بھرنے سے پہلے بار بار سوچے گا کہ آیا وہ اس ذمے داری کو اٹھانے کے قابل ہے یا نہیں، قرآن مجید جیسی کتاب کا ایسا نسخہ تیار کرکے اسے قیامت تک کے لیے جاری کر دینا جس میں جمع کرنے والے کے ایمان کے مطابق نہ صرف اس دنیا میں بلکہ دوسرے عالم میں بھی جوابدہی کرنا تھی، کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا، زیدؓ کا یہ کہنا کہ اگر مجھے پہاڑ ہٹانے کا حکم دیا جاتا تو بھی میں اس کو اس کام کے مقابلہ میں آسان سمجھتا، یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ کام اس لیے ان کو مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے ہزاروں غیر مرتب اور غیر مربوط ٹکڑوں کو جمع کرکے مرتب اور اڈٹ کرنا پہاڑ ہٹانے سے زیادہ مشکل نظر آیا، بلکہ اس احساس ذمہ داری کو ظاہر کرتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا،

اللہ تربت ٹھنڈی رکھے زید بن ثابتؓ کی اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ابن ابی قحافہؓ کو، ایک کی سرکردگی میں دوسرے نے وہ کام کیا جس سے انکا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جریدۂ عالم پر ثبت ہوگیا،

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور حقیقت ذہن نشین کر لیجئے۔

بہت سی متفرق چیزوں کو آپس میں منسلک اور مربوط کرنے کے طریقے، ان کی تعداد کے لحاظ سے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کا گمان بھی اول نظر میں نہیں ہوتا،

فرض کیجئے کہ دو عددوں، ۱-۲ کو آپ دو ترتیبوں سے رکھ سکتے ہیں، ۱-۲ و ۲-۱

لیکن اگر اس میں ایک عدد اور بڑھا دیجئے، اور تین عددوں کو آپس میں مرتب کرنا شروع کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اب انھیں تین نہیں چار نہیں بلکہ چھ (۲×۳) طریقوں سے مرتب کیا جا سکتا ہے [۱-۲-۳ و ۱-۳-۲ و ۲-۱-۳ و ۲-۳-۱ و ۳-۱-۲ و ۳-۲-۱]

اب سات عددوں کو لیجئے، اس کے ممکن طرق کی مجموعی تعداد [۲×۳×۴×۵×۶×۷] ۵۰۴۰ ہوتی ہے یعنی اگر سورۂ فاتحہ کی آیات کو ترتیب دینا شروع کیجئے تو وہ پانچ ہزار چالیس

طریقوں سے مرتب کیجا سکتی ہیں، اس سے آپ قرآن کی موجودہ سورتوں کی ترتیب کا قیاس کر سکتے ہیں، جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔

ایسی حالت میں ایک ہی طریق ترتیب پر لوگوں کا اجماع کیوں ہوا، اور قرآن جیسی کتاب کے لیے، اور وہ بھی کل اٹھارہ مہینوں کی قلیل مدت میں یہ سارا کام نپٹا لیا گیا، درانحالیکہ وہ بزرگ جن کے پاس قرآن کے حصے موجود تھے وہ اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، بعضے تو تین تین دن کی مسافت طے کر کے آتے تھے، اور اپنا لکھا یا یاد کیا ہوا قرآن کا حصہ پیش کرتے تھے، اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جمع قرآن کا کام یہ نہیں تھا کہ مختلف لوگوں سے لیکر قرآن کی سورتیں جمع کر دی جائیں، پھر انھیں من مانے طریقے سے مرتب کر دیا جائے، بلکہ اس کا وہی مطلب ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ اگر قرآن کے حصے مختلف ایسے حضرات کے پاس تھے جو سارے جزیرۃ العرب میں پھیلے ہوئے تھے، تو اس بات کے چک کرنے کی کوئی سبیل نہ تھی کہ سارے اجزا جمع ہو گئے یا نہیں، اور یہ امکان باقی رہتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اس ذخیرہ کے جمع کرنے سے رہ گیا ہو، مگر یہ شبہہ چنداں قابل توجہ نہیں، کیونکہ اس شبہہ کے خلاف وہ سلبی شہادت دلیل ناطق ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے،

ایک اور پہلو بھی ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ جیسے جیسے قرآن پر تحقیق ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے یہ بات روشن ہوتی جاتی ہے کہ آیات کی ترتیب تو ہے ہی، سورتوں کی ترتیب بھی ایک خاص اسکیم کے مطابق ہے، اور ایک سورہ کا اخیر اور دوسری کا شروع باہم مربوط ہیں، مثلاً سورۂ نساء کا آخیر انسان کو توحید اور عدل کی تعلیم دیتا ہے۔ سورۂ مائدہ جو متصلاً اس کے بعد شروع ہوتی ہے اس کی ابتدا بھی یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود یعنی ایمان و عدل کی تعلیم سے ہوتی ہے، اگر اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ انسان نے ازل میں توحید کا عہد و پیمان کیا تھا، اور عدل کا تقاضا

یہ ہے کہ جو وعدہ کیا جائے پورا کیا جائے، تو اس ترتیب کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے، سورہ واقعہ کے آخیر میں تسبیح کا حکم ہے، اور اس کے بعد کی سورہ حدید بھی تسبیح سے شروع ہوتی ہے، سورۂ ماعون میں چار باتوں کی مذمت کی گئی ہے، ترک صلوٰۃ، ریاکاری، بخل اور منع زکوٰۃ۔ اس کے بعد متصلاً سورۂ کوثر ہے جس میں اس کے تقابل کے چار اوصاف بیان کیے گئے ہیں، بخل کے مقابل انا اعطینا ک الکوثر، ترک صلوٰۃ کے مقابل "فصل" نماز کا حکم، ریاکاری کے مقابل لربک یعنی اپنے رب کے واسطے دکھاوے کے لیے نہیں، اور منع زکوٰۃ کے مقابل میں وانحر یعنی قربانی کر کے لوگوں کو کھلاؤ پلاؤ،

میں نے یہاں صرف چھ سورتوں کا ذکر کیا ہے، نساء، مائدہ، واقعہ، حدید، ماعون اور کوثر صرف ان چھ سورتوں کو آپس میں ۷۲۰ (۲×۳×۴×۵×۶) طریقوں سے مرتب کیا جا سکتا تھا، ان سات سو سے اوپر طریقوں میں سے صرف وہ طریقہ کیسے ہاتھ لگ گیا جو ان کی ترتیب کا بہترین طریقہ تھا، اس کو بخت و اتفاق نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ بخت و اتفاق ایک مرتبہ یا چند مرتبہ یا کچھ اس سے بھی زیادہ پیش آسکتا ہے، مگر ایک ہی طرح کے لاکھوں واقعات کو بخت و اتفاق کسی طرح نہیں کہا جا سکتا، اسلیے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ سورتوں کی ترتیب میں کوئی باہمی ربط ہے، اور اسکی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) یا تو یہ ترتیب خود صاحب قرآن کی دی ہوئی ہے،

(۲) یہ محض ایک معجزہ ہے،

دونوں صورتوں میں یہ امر یقینی ہے کہ یہ کام امت کا نہیں ہے، خواہ وہ امت خیر القرون کی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے اس نتیجہ پر پہنچے بغیر چارۂ کار نہیں ہے کہ ترتیب سور انسانی نہیں بلکہ الہامی ہے،

حضرت زید کہتے ہیں کہ میں نے قرآن عسیب[1]، لخاف، اور صدور الرجال سے جمع کیا، اس کا مطلب بھی صرف یہی ہے کہ یہ سب کام اس نسخہ کو مرتب کرنے کے لیے کیا گیا تھا، جو خلیفۂ وقت کے پاس رکھا جاتا تھا،

[1] عسیب کھجور کی شاخ اور عام قسم کے درختوں کا وہ حصہ جو تنہ سے متصل ہوتا ہے، لخاف بیضوی رنگ کے پتھر کی چوڑی تختیاں،

مختلف روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت زیدؓ کا طریق کار وہی تھا جو آجکل کے محققین کرتے ہیں یعنی پہلے اس تمام مواد کو جو کسی موضوع پر فراہم ہو سکتا ہے، جمع کرتے ہیں، پھر اسکی چھان بین کرتے ہیں، اور جو چھان بین سے صحیح ثابت ہوتا ہے اس سے ایک کتاب مرتب کرتے ہیں.

حضرت عمرؓ کی منادی کے بعد صحابہ دور دور سے آتے اور قرآن کا جو حصہ انھیں یاد ہوتا یا جو ان کے پاس لکھا ہوا ہوتا اسے زیدؓ کے سامنے پیش کرتے، زیدؓ کو قرآن مجید زبانی بھی یاد تھا، اور انکے پاس لکھا ہوا بھی موجود تھا، پھر بھی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ خود اپنی یاد اور اپنی مکتوبہ تحریر سے مقابلہ کر لینا کافی تصور نہیں کیا. بلکہ اسلامی اصول شہادت کے مطابق اس کی دو گواہیاں لیتے تھے کہ قرآن کا جو حصہ پیش کیا گیا ہے، اسے نبی کریم صلعم سے بعینہ اسی طریق سے سنا گیا تھا.

آج کی دوڑ دھوپ کی دنیا میں اس احتیاط کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی کے قول کی صحت کی تحقیق کے لیے اتنی چھان بین کی ضرورت ہے، اور ایسا عملاً ممکن بھی ہے یا نہیں، اور پھر اہتمام کے ساتھ کہ نہ صرف کہنے والے کا مطلب ادا کر دیا جائے بلکہ بعینہ اور بجنسہ وہی الفاظ بھی استعمال کیے جائیں اور اس ترتیب اور وقفہ کے ساتھ جس طرح کہنے والے نے کہا تھا، اور زبان وحی ترجمان سے قرآن کا جو لفظ بھی جس طرح ادا ہوا تھا، وہ بلا ادنیٰ تغیر کے ٹھیک اسی طرح ادا کیا جائے اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت تک دنیا کی کوئی کتاب چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی ایسی نہیں ہے جس میں اس احتیاط سے کام لیا گیا ہو،

اسے ماننے میں تامل نہیں کہ یہ بحث زیادہ تر ترتیب آیات کو ثابت کرتی ہے، اور ترتیب سور سے اسکا تعلق دور کا ہے، مگر تعلق سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسلیے یہ بحث ترتیب سور سے بالکل غیر متعلق بھی نہیں ہے، کیونکہ جب آیات کی ترتیب ایک نہج پر قائم ہو گئی تو سورتوں کی ترتیب بھی بالواسطہ اسی طرح قائم ہوئی.

اس کو زیادہ واضح طور پر یوں سمجھئے کہ بفرض محال ایک شخص کو قرآن اس طرح یاد ہے کہ

پہلے سورۃ الناس، پھر فلق، پھر کوثر، پھر اخلاص، دوسرے شخص کو فلق، پھر کوثر، پھر اخلاص تیسرے کے پاس لکھی ہوئی ترتیب کچھ اور ہے،

جب یہ سب ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں تو "جامع" قرآن کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے نسخہ میں ان سورتوں کو کس ترتیب سے لکھے، یونہی رہنے دے، قرعہ ڈالے، استخارہ دیکھے، اور بخت و اتفاق کے ہاتھوں سے ترتیب سور کا فیصلہ کرائے، یا خود اپنی ذہانت اور دوسرے ساتھیوں کی اعانت سے اس ترتیب کو طے کرے، ترتیب سور کوئی اہم چیز ہے یا نہیں، اس کے متعلق اوپر عرض کیا جا چکا ہے، اگر ترتیب سور میں بھی قرآن کی کوئی اسکیم ہے، جیسا کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، تو یہ نتیجہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ترتیب سور کی اسکیم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متعین فرما گئے تھے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ "عرضۂ اخیرہ" میں رسول اکرمؐ نے پورا قرآن دو بار حضرت جبرئیلؑ کو سنایا تو کیا دونوں بار علیحدہ علیحدہ ترتیب سے قرآن سنایا گیا یا ایک ہی ترتیب سے،

حضرت زیدؓ کے پاس لکھا ہوا قرآن کا جو نسخہ تھا، اس میں لازمی طور پر سورتیں کسی ترتیب ہی سے رہی ہوں گی، "عرضۂ اخیرہ" میں زید اور ابی بن کعبؓ دونوں شامل تھے، اگر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی ترتیب زیدؓ یا ابیؓ بن کعب کے نسخے کی ترتیب سے مختلف تھی تو زیدؓ یا ابیؓ بن کعب کو یہ بات کیوں نہیں کھٹکی کہ جس ترتیب سے نبی کریمؐ نے قرآن سنایا ہے، اس ترتیب سے وہ اپنے نسخہ کو مرتب کریں.

جو کلام رٹ لیا جائے اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر اس کی ترتیب الٹ پلٹ دی جائے تو حافظ آسانی سے اپنی یاد سے اس بدلی ہوئی ترتیب سے نہیں سنا سکتا، یادداشت کی کمی بیشی کی کیفیت ٹیپ ریکارڈ کی جیسی ہوتی ہے، اس میں جس ترتیب سے آواز بھری جائے گی اسی ترتیب سے اسے چلانے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے،

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ جس ترتیب سے یاد ہے، اگر اس ترتیب سے سنایا جائے تو اس کا امکان نہیں رہتا کہ کوئی حصہ سنانے سے رہ گیا ہے، اور بلا ترتیب گڈمڈ طریقہ سے سنانے میں اس کا امکان رہتا ہے، اس کا بڑا آسان تجربہ ہے، ایک سے سو تک کی گنتی کس کو یاد نہ ہوگی، اس گنتی کو یاد سے بلا ترتیب لکھنے کی کوشش کیجئے تو دیکھئے کہ کتنی مرتبہ میں آپ پوری گنتی لکھ پاتے ہیں، اس عمل میں ہر مرتبہ آپ کو بار بار یہ غور کرنا پڑے گا کہ کوئی عدد چھوٹ تو نہیں گیا،

قرآن میں تو سو سے بھی زیادہ ایک سو چودہ سورتیں ہیں، ان سب کو ایک ساتھ سنا دینا صرف اسی وقت ممکن ہے جب یہ سب سورتیں ایک سلسلہ میں منسلک ہوں، اور یہ سنانا صرف ایک ہی دفعہ نہ ہو بلکہ تین دفعہ ہوا ہو، عرضۂ اخیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار قرآن سنایا، اور حضرت زیدؓ نے بھی اس سال ایک بار قرآن سنایا،

یہ مانا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ آپ کا معجزہ تھا کہ غیر منسلک سورتوں کو شروع سے اخیر تک بغیر کسی کمی اور زیادتی کے ایک بار نہیں بلکہ دو بار سنا دیا، لیکن حضرت زیدؓ تو یہ معجزہ نہیں دکھا سکتے تھے، ان کو قرآن سن کر یہ کیسے اطمینان ہو گیا کہ پورا قرآن بلاکم وکاست انھوں نے سن لیا ہے، اور ان کا یہ اطمینان اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن سننے کے بعد انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ نے پورا قرآن سنا دیا ہے یا نہیں، کیونکہ اسکی کوئی روایت نہیں ملتی، اور یہ صرف اس وقت ممکن ہو سکتا تھا، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب تلاوت سور بعینہ و بجنسہ وہی ہوتی جیسی کہ زیدؓ اور ابیؓ بن کعب کے مصحفوں میں تھی،

ایک اور چھوٹی سی بات جو اس سلسلہ سے ذہن میں رکھنے کی ہے یہ ہے کہ متعدد کتب احادیث میں یہ روایت ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا،

(۱) سبع طوال، بقرہ سے یونس تک،

(۲) مائین: یونس کے بعد کی سورتیں جن میں سو سے کم آیتیں ہیں،

(۳) مثانی: مائین کے بعد کی سورتیں سورہ قاف تک،

(۴) مفصل: قٓ سے والناس تک،

تلاوت میں سہولت کے لیے قرآن مجید کو مختلف حزبوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا، اوس بن حذیفہ ثقفی کے بیان کے مطابق ان حزبوں کی تقسیم تین، پانچ، سات، نو، گیارہ اور حزبِ مفصل پر تھی،

اس روایت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

سألنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احزاب القرآن کیف تحزبونه فقالوا ثلاث وخمس وسبع وتسعة، واحدی عشر وحزب المفصل۔

یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ثقیف کے وفد کے موقع پر پیش آیا، مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "بقرہ اور آل عمران پڑھو" بخاری میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "بنی اسرائیل، کہف، مریم، طہٰ، انبیاء میرا خزانہ ہیں"، ایک دوسری حدیث ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسترِ استراحت پر تشریف لے جاتے تھے تو اخلاص، فلق اور الناس پڑھ کر دم کر لیتے، بعینہ یہی ترتیب کلام مجید کی سورتوں کی آج بھی ہے،

اس سے پہلے سر ولیم میور کی یہ رائے پیش کی جا چکی ہے کہ قرآن میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی، ورنہ محمدؐ کے راوی جنھوں نے محمدؐ کی چھوٹی سے چھوٹی بات روایت کی ہے، اسے ضرور روایت کرتے، یہ اعتراف اس لیے ناگزیر تھا کہ واقعۂ سیرت طیبہ کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی روایات میں موجود ہیں، اس کی وجہ اولاً تو یہ تھی کہ اصحاب نبی کریمؐ کو ذاتِ نبوی سے بے انتہا عشق تھا، دوسری بڑی وجہ یہ حکم تھا کہ خواہ ایک آیت ہو یا ایک چھوٹا سا جزئیہ میرے متعلق ہو، تم لوگ دوسروں تک پہنچا دو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کی کوئی ہستی ایسی نہیں ملتی ہے جس کی زندگی کے متعلق اتنی چھوٹی چھوٹی

باتیں، اتنی جزئیات، اتنی تفصیل سے قلمبند کی گئی ہوں، جتنی اس ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھی گئیں اور جسے آج بھی لوگ اسی ذوق و شوق سے پڑھتے اور اس پر کاربند ہونے کی کوشش کرتے ہوں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، نپولین کی ایسی شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری روشنی میں ظاہر ہوئی اور جس کے حالات بہت ہی تفصیل سے مرتب کیے گئے، لیکن اس کی زندگی کے متعلق بھی وہ تفصیلات نہیں ملتیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ملتی ہیں، اور جہاں ان جزئیات کا تعلق کسی مذہبی معاملہ سے ہو وہاں تو اس کی ہلکی سے ہلکی جنبش لب، ہلکے سے ہلکے اتار چڑھاؤ بھی سپرد قلم کر دیا گیا ہے، نمونۃً اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں،

عن انسؓ انه سئل عن قرأة رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال کانت مدا ثم قرأ بسم الله الرحمن الرحیم یمد الله ویمد الرحمن (اتقان)	حضرت انسؓ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأۃ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے کہا کہ آپ کھینچکر پڑھتے تھے، پھر بسم اللہ پڑھی اور لفظ اللہ اور الرحمن کو کھینچ کر پڑھا۔

بخاری شریف میں ہے:۔

کان یمد ببسم الله ویمد الرحمن ویمد الرحیم	بسم اللہ کو کھینچ کر پڑھتے اور الرحمن اور الرحیم کو مد کے ساتھ پڑھتے،

شمائل ترمذی میں روایت ہے

عن یعلی بن مملکؓ انه سئل ام سلمة عن قرأة رسول الله فاذاهی تنعت قرأة مفسرة حرفا حرفا	حضرت ام سلمہؓ سے رسول اکرمؐ کی قرأت کا طریقہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے وضاحت سے حرفاً حرفاً بیان کیا۔

اسی شمائل میں شعبہ کی ایک روایت ہے کہ جب سرکار دو عالم مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے تھے تو

آپ کی زبان مبارک پر سورۂ فتح تھی، اس کے بعد کہتے ہیں:

قال ورجع	آپ نے ترجیع فرمائی

ایک اور روایت اسی کتاب کی ہے، جس میں ہے کہ

کان النبی حسن الوجه حسن الصوت وکان لا یرجع	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوبصورت جمال، خوش آواز تھے، اور ترجیع نہیں کرتے تھے،

یہاں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ترجیع کرتے تھے یا نہیں، مقصد صرف اس قدر ہے کہ اصحاب نبی کریمؐ آپ کی ادنیٰ ادنیٰ بات کو روایت کرتے تھے، اور جس بات کا تعلق مذہب یا اس کے سرچشمہ قرآن سے ہوتا تھا، اس کو اس تفصیل سے یاد رکھتے تھے کہ کس حرف کو آپ نے کس طرح ادا کیا، اور کس لفظ کو کھینچ کر پڑھا، اور اس پر اصرار کرتے تھے کہ قرآن بالکل اسی طرح پڑھا جائے جس طرح رسول اکرمؐ نے تعلیم دی ہے، بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہشام کو سورہ فرقان پڑھتے سنا تو انکی گردن میں چادر ڈالی، رسول اکرمؐ کی خدمت میں گھسیٹ لائے اور عرض کی کہ انی سمعت هذا یقرأ القرآن غیر ما اقرأتنیها کہ یہ قرآن اس طرح نہیں پڑھتے ہیں، جس طرح آپ نے ہم کو پڑھایا ہے،

رموز اوقاف قرآن جو قرآن کے ہر نسخہ کے شروع میں تحریر ہوتے ہیں، ان کو ملاحظہ فرمائیں، پھر خود کلام مجید کا کوئی صفحہ کھول لیجئے، آپ دیکھیں گے کہ بہت سی جگہوں پر رکنے کا اور بہت سی جگہوں پر نہ رکنے کا، کہیں وصل کا، کہیں فصل کا، کہیں بغیر سانس توڑے ہوئے ایک خفیف وقفہ کا اشارہ ملے گا، اور اس میں سے ہر چیز ذات گرامی کے عمل پر منتہی ہوتی ہے۔

اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں "سات قاری تھے، عثمانؓ، علیؓ، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابن مسعودؓ، ابو الدرداءؓ، اور ابو موسیٰ اشعریؓ۔ ان لوگوں کی قراتوں میں کہیں مخارج حروف اور ان کی کیفیت ادا میں اختلافات واقع ہو گئے تھے، بعض لوگوں نے ان اختلافات کو منضبط

کرنا شروع کیا، یہی لوگ قراء کے نام سے موسوم ہوئے، ہر ایک قرأت کو اپنے شیوخ و اساتذہ سے نقل کرتا تھا، یہ روایتیں مسلسل باسناد ہوتی تھیں،[1]

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کلام مجید کے متعلق جہاں اتنی تفصیل سے باتیں یاد رکھی گئیں کہ آیت کے کس لفظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچکر پڑھا، کسے ملا کر پڑھا، کہاں وقف کیا، کہاں سانس توڑی، کہاں نون با علان پڑھا، کہاں نہیں پڑھا، اس کتاب کے متعلق ... لوگوں نے یہ یاد نہ رکھا کہ کونسی سورہ پہلے ہے اور کونسی بعد میں، اس کو کونسی عقل تسلیم کرسکتی ہے،

ایک روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے آل عمران پہلی رکعت میں پڑھی، بقرہ دوسری رکعت میں، یہ اور اسی قسم کی دوسری حدیثیں جو سورتوں کی قرأت کے متعلق پائی جاتی ہیں، ان میں دو باتیں قابل توجہ ہیں،

پہلی یہ کہ ان حدیثوں سے نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے، آپ اگر میرے اس نظریہ سے متفق ہیں کہ قرآن ہر زمانہ اور تمام اوقات میں ایک منظم اور مرتب کتاب کی شکل میں مدون تھا اور اصحاب مصاحف کے پاس اسی نظم و ترتیب سے جمع تھا، تو دوسری بات قابل توجہ بات ہوگی کہ ان حدیثوں سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ راوی نے جب یہ کہا کہ آل عمران پہلے پڑھی اور بقرہ بعد میں تو اس کے تحت الشعور میں یہ بات موجود تھی کہ مصحف میں اس کی ترتیب معکوس ہے، اس کی تائید من قراء قرانا معکوسا کی روایت سے ہوتی ہے، یعنی قرآن میں سورتوں کی ایک ترتیب تھی، جس کے خلاف پڑھنا معمول نہ تھا، اس لیے جب اس کے برعکس آپ نے نماز میں قرأت فرمائی تو یہ بات فوراً لوگوں کی نوٹس میں آگئی، اس سے ترتیب سور کی ایک مزید شہادت ملتی ہے،

دوسرا رخ اس کا یہ ہے کہ ان احادیث سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور اکرمؐ نے

[1] تاریخ القرآن،

نماز میں مختلف رکعتوں میں سورتوں کی قرأت میں وہ ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جو مصحف میں تھی، اس لیے نماز میں سورتوں کا قرآنی ترتیب سے پڑھنا ضروری نہیں ہے، لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن میں ترتیب سور تھی ہی نہیں، یا آپ نے مصحف میں ترتیب فرمائی نہیں،

ان دلائل کی روشنی میں یہ نتیجہ کہ آنحضرتؐ نے خود سورتوں کی ترتیب نہیں فرمائی تھی، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اکابر علماء کی رائے ہے کہ ترتیب سور بھی اسی طرح توقیفی ہے جیسے ترتیب آیات بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں دو ایک بزرگوں کی رائے نقل کردیجائے،

مشہور اندلسی عالم ابن حزم ظاہری اپنی کتاب الفصل میں لکھتے ہیں

من قال ان تقسیم الآیات وترتیب — جو یہ کہتا ہے کہ آیات کی تقسیم اور سورتوں
مواضع سورۃ فعل الناس لیس — کی جگہوں کی ترتیب لوگوں نے متعین کردی ہے
من عند الله، فقد کذب، — اللہ کی طرف سے نہیں ہے وہ جھوٹا ہے جاہل ہے،
هذا جاهل وافك افتراه (تاریخ القرآن، رحمانی) — اور اس نے افک و افتراء سے کام لیا،

ابن حزم اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر سورتوں کی ترتیب انسانی ہوتی تو اس کے تین طریقے ہوسکتے تھے، یا تو ترتیب زمانۂ نزول کے لحاظ سے ہوتی یا سورتوں کی مقدار (سائز) کے لحاظ سے، یعنی پہلے بڑی پھر چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی یا اس کے برعکس، پہلے چھوٹی پھر بڑی پھر اس سے بڑی، لیکن موجودہ قرآن کی ترتیب سور ان تینوں طریقوں سے مختلف ہے، اسلیے یہ ترتیب انسانی نہیں الہامی ہے،

اگر آپ نے مستشرقین یورپ کی تحریروں کو پڑھا ہوگا تو دیکھا ہوگا کہ یہ سب بڑی شدومد سے کہتے ہیں کہ قرآن میں سورتوں کی ترتیب میکانیکی ہے، پہلے بڑی بڑی سورتیں لکھی گئی ہیں، پھر اس سے چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی، قرآن کا جو ایک ورقی عکسی مخطوطہ ہے، اس کو دیکھئے، بادی النظر میں اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے، اس مخطوطہ میں جہاں جہاں قرآن کی سورتیں ختم ہوئی ہیں، وہاں

سرخی سے نشانات بنائے گئے ہیں، یہ سرخ نشانات پہلے دور دور ہیں، پھر قریب ہو جاتے ہیں، اور پھر قریب تر،

قرآن کی احزاب میں تقسیم والی جو روایت پیش کیجا چکی ہے، اس میں بھی کچھ ایسا ہی، ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے سبع طوال، سات بڑی سورتیں، پھر مائین، پھر اس سے کم سو آیتوں والی سورتیں، پھر مثانی پھر بقیہ ان سے چھوٹی، وقس علیٰ ہذا،

عام طور پر خیال بھی یہی ہو کہ قرآن کی سورتوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پہلے بڑی، پھر اس سے چھوٹی، پھر اس سے چھوٹی، اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کی جو تقسیم احزاب میں کی گئی ہے وہ بادی النظر میں مجموعی طور پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ ترتیب سور سائز کے لحاظ سے ہوئی ہے، یعنی احزاب کی مجموعی تصویر کچھ ایسی ہے کہ سورتیں اس میں اپنے حجم کے لحاظ سے مرتب ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا یہ بات ابن حزم کو نظر نہیں آئی یا اس میں کوئی اور بات ہے جو سطحی نہیں ہے،

احزاب کے اندر جو سورتیں ہیں ان کے حجم پر غور فرمائیے یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورت کا حجم اس میں آیات کی تعداد کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا ہے، آیتیں ایک حجم یا سائز کی نہیں ہیں، کوئی آیت بہت بڑی ہے، جیسے آیۃ الکرسی، کوئی بہت چھوٹی ہے، جیسے "قیل من راق"۔ اس لیے اگر سورتوں کا سائز آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے متعین کیا جائیگا، تو یقینی طور پر ایک سورت اور دوسری سورت میں آیتوں کی تعداد برابر ہونے کے باوجود سائز میں فرق ہوگا، لیکن چونکہ یہ امر معرض بحث میں نہیں ہے، اس لیے اس پر توجہ نہیں دیجا رہی ہے، صرف بسبیل تذکرہ یہ عرض کر دیا گیا،

۱۔ احزاب میں سے کسی حزب کو لے لیجئے، اور ان میں سورتوں کے درمیان جو ترتیب ہے اس پر آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے غور کیجئے؛

اس وقت میرے سامنے کلام مجید کی چوتھی منزل سورۂ اسرا ہے، سورۂ فرقان تک ان

میں آیات کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

(۱) اسراء ۱۱۱ (۴) طہ ۱۳۵ (۷) مومنون ۱۱۸

(۲) کہف ۱۱۰ (۵) انبیاء ۱۱۲ (۸) نور ۶۴

(۳) مریم ۹۸ (۶) حج ۷۸ (۹) فرقان ۷۷

غور کیجئے کہ اس میں پہلی تین سورتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کی تعداد کے لحاظ سے سورتیں رکھی گئی ہیں، پہلے سب سے زیادہ، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم،

چوتھی سورہ میں آیات کی تعداد ۱۳۵ ہے، جو تمام سورتوں سے زیادہ ہے، اس کے بعد سورۂ انبیاء میں ۱۱۲ آیتیں ہیں، پھر حج میں ۷۸، مومنون میں ۱۱۸، نور میں ۶۴ اور فرقان میں ۷۷ ہیں، اگر محض تعداد آیات سے سورہ کا مقام متعین ہوتا تو طہ ایک نمبر پر ہوتی، پھر مومنون، پھر انبیاء، پھر اسرا وغیرہ، اور سب کے آخر میں سورۂ نور،

قرآن کے اور احزاب کو بھی اسی طرح بالاستیعاب دیکھ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب میکانیکی ہے، کتنا اوچھا اور باطل ہے، ان خدا کے بندوں سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ذرا محنت کر کے آیتوں کی تعداد مختلف سورتوں میں دیکھ لیتے قبل اس کے کہ اس قسم کا دعویٰ کر دیتے جس کا کوئی ثبوت واقعۃً نہیں ہے،

ہاں ایک بات ضرور اس توجیہ کی تائید میں کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام عام طور سے گنتی نہ جانتے تھے، اس لیے انھوں نے محض اندازے سے سورتیں گڈمڈ کر دیں، جن کو بعد میں لوگوں نے گنا،

مگر خود ان مستشرقین کے قول کے مطابق ترتیب سور ۱۲ھ میں ہوئی، جب یمامہ کی جنگ ہو چکی تھی، زکوٰۃ کی وصولیابی شروع ہو چکی تھی، جب عمال وصولی زکوٰۃ کے لیے مقرر ہو چکے تھے، اور حساب کر کے کسی سے بکری کا بچہ، کسی سے غلہ، کسی سے درہم و دینار وصول کرتے تھے، جب بیت المال سے لوگوں کے وظائف مقرر

ہو چکے تھے، اور ان سب کے لیے گنتی جاننا اور حساب لگانا ضروری تھا۔

جو لاکھوں کا حساب کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بیچارے یہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ دس۔

۹۰ سے زیادہ ہے، کس طرح قابل یقین ہو سکتا ہے،

دوسرا قول امام مالک کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن جو اب ہمارے پاس ہے، صحابہ نے اس کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھا تھا جس ترتیب سے آنحضرتؐ کو پڑھتے سنا تھا،[1]

امام بغوی کہتے ہیں صحابہ نے قرآن کو اس ترتیب سے جمع کیا جس ترتیب سے آنحضرتؐ کو پڑھتے سنا گیا۔"

قاضی ابوبکر کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے، جس طرح آیات کی ترتیب حضرت جبرئیلؑ نے آنحضرتؐ کو بتائی تھی، اسی طرح سورتوں کی ترتیب بھی بتائی تھی، جس قدر قرآن اتر چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان میں اس کو دہرا لیا کرتے تھے، اور حضرت جبرئیلؑ مرتب کرا دیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفا میں حضرت عثمانؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"جمع کرد قرآن را بحضور آنحضرتؐ و ترتیب دادہ بود آں را۔"

مولانا فراہی لکھتے ہیں[2]: "قرآن کے اندر نظم کی تلاش میں میں تنہا نہیں ہوں، مجھ سے پہلے بھی علما کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں، چنانچہ علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں: "ابو حیان کے شیخ علامہ ابو جعفر ابن زبیر نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے، اس کا نام البرہان فی مناسبۃ سور القرآن" ہے۔

اس کے بعد سیوطی لکھتے ہیں "نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے، اس کے اشکال کی وجہ سے علما نے اس سے بہت کم بحث کی ہے، امام فخر الدین رازی تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے؛ انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب و نظم کے اندر چھپا ہوا ہے"۔

خود مجھے امام رازی کی تفسیر کبیر میں آیت ولو جعلناہ قرآنا عربیا الآیۃ حٰم سجدہ کے تحت

---

[1] تاریخ القرآن حافظ اسلم جیراجپوری [2] تفسیر نظام القرآن مولانا حمید الدین فراہی، طبع اول ص ۷

نظم قرآن سے متعلق ان کا مندرجہ ذیل بیان ملا۔

"اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ روایت ہے کہ کفار نے ازراہ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، میرے نزدیک اس طرح کی بات سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے"۔

"اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں باہم کوئی تعلق نہیں ہے، یہ چیز قرآن مجید پر ایک بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے، اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کا ایک معجزہ ثابت کرنا تو الگ رہا ہم اس کے ایک منظم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: (ملحدین نے) قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا، اور میں نے دیکھا کہ علمائے اسلام اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ حق کا اظہار کرتے اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کرتے اس قسم کی باتیں خود بولنے لگے جس قسم کی باتیں ملحدین کہہ رہے تھے، کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم،

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا، پھر اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کیا، اور اس کے توضیح طلب مقامات کی تشریح فرمائی، جیسا کہ سورۂ قیامہ میں آیا ہے ان علینا جمعہ وقرآنہ۔

آگے چل کر امام سیوطی کا قول نقل کرتے ہیں:۔

"پہلے شخص جنھوں نے اپنے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا، شیخ ابوبکر نیشاپوری ہیں، وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے اور بتاتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں لکھی گئی، اور فلاں سورہ فلاں سورہ کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورہ کے فلاں سورہ کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے"۔

ہمارے یہاں کے علما میں فراہی نے نظم قرآن پر بڑی توجہ دی ہے، اور نہ صرف آیات میں ربط کا کھوج لگایا ہے بلکہ سورتوں میں باہمی مناسبت کی بھی نشان دہی کی ہے، سورۂ والعصر کی تفسیر کے سلسلہ میں اس سورہ کا تعلق ماقبل اور مابعد کی سورتوں سے ظاہر کیا ہے، یہ تین آیتوں کی سورہ ہے، اس کے پہلے سورہ تکاثر آٹھ

آیتوں کی اور ما بعد کی سورہ ہمزہ نو آیتوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سورتوں کا نظم تعداد آیات کے لحاظ سے تو نہیں ہے،

مولانا فراہی فرماتے ہیں :۔

سورہ تکاثر میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ ارباب نعمت وجاہ طلب مال و عیش دنیا کی خود فراموشیوں میں گم ہیں، ان کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کا محور بس دنیا ہے، جس کے عشق میں انھوں نے اپنی عمریں گنوا دیں، حالانکہ اس سے بڑے کوئی بدبختی و نامرادی نہیں ......

والعصر ابتدائے سورہ میں ان لوگوں کی نامرادی کو بیان کیا ہے، جو عشق دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں، پھر اصل کامیابی کی طرف اشارہ کیا کہ اس عمر فانی کے اندر نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کر کے یہ دولت جاوداں حاصل کی جا سکتی ہے، پس لوگوں کو چاہیے کہ وقت کی قدر کریں اور غفلت و سرمستی کی نیند سے بیدار ہو کر حسرت و افسوس کی ساعت سے پہلے اس چیز کی سعی و طلب میں مشغول ہوں جو چاہنے کی ہے۔

بعد والی سورہ ہمزہ میں اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے، جس میں یہ ارباب نعمت مبتلا ہوں گے، پس یہ سورہ ان دونوں سورتوں کے درمیان رکھی گئی تاکہ آرزوؤں کی نامرادی اور کوششوں کی بربادی پر تنبیہ فرمائی جائے۔[1]

مولانا بحر العلوم شرح مسلم میں لکھتے ہیں، "قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، آنحضرت صلعم سے ثابت ہے، اس لیے کہ ان دس قاریوں نے جن کی فہرست قرأت اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہے، ایسی صحیح سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، قرآن کو اس ترتیب سے نقل کیا۔"

یہ چند رائیں ہیں جو مشتے نمونہ از خروارے، صرف اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ جن لوگوں نے عمریں کلام مجید پر غور و خوض میں صرف کی ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نظم قرآن میں سورتوں کی ترتیب محض اندازے نہیں ہے، بلکہ ایک بلند و بالا اسکیم کے ماتحت ہے، اور یہ رائیں ایسی نہیں ہیں جنھیں سرسری طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔

اگرچہ یہ میرا منصب نہیں ہے مگر صرف اس خیال سے کہ بات ادھوری نہ رہ جائے، ان روایات پر

[1] تفسیر سورہ والعصر، طبع اول ص ۲ - ۸ - ۳

جن سے یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ ترتیب سور آنحضرت صلعم کے زمانہ مبارک میں مکمل نہیں ہوئی تھی، تنقید روایت کے لحاظ سے غور کیا گیا۔

اس سلسلہ میں بڑی بے لاگ تنقید مولانا عبد اللطیف صاحب رحمانی نے تاریخ القرآن میں کی ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، کچھ روایات ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں قرآن کی آخری دو سورتیں نہ تھیں، اور آپ قرآن سے ان سورتوں کو مٹا دیا کرتے تھے۔

معوذتان کے متعلق حضرت ابن مسعودؓ سے تین شخصوں کی روایتیں ہیں (۱) عبدالرحمٰن بن یزید (۲) علقمہ (۳) زر بن حبیش، عبدالرحمٰن کی روایت کو ابن کثیر نے تفسیر میں اور اتقان میں ابن حجر سے نقل کیا ہے، اتقان میں من مصاحفہ کی جگہ من المصحف ہے، روایت یہ ہے:

عبداللہ بن ابی احمد من حدیث الاعمش عن ابی اسحٰق عن عبدالرحمٰن بن یزید، قال کان عبداللہ یحک المعوذتین من مصاحفہ ویقول انہما لیستا من کتاب اللہ

عبداللہ بن ابی احمد نے اعمش کی حدیث کو ابو اسحٰق سے اور انھوں نے عبدالرحمٰن بن یزید سے روایت کی کہ عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو مصاحف سے مٹا دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دونوں آیات اللہ سے ہیں۔

دوسری روایت امام نخعی کی حسب ذیل ہے:۔

عبداللہ بن احمد عن عبدالرحمٰن بن یزید قال کان عبداللہ یحک المعوذتین من المصحف ویقول انما امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یتعوذ بہما ولم یکن عبداللہ یقرأ بہما ویقول انہما لیستا من کتاب اللہ

عبداللہ بن مسعود معوذتین کو صحیفہ سے مٹا دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اکرمؐ نے حکم دیا ہے کہ ان دونوں کے ذریعہ پناہ طلب کی جائے اور عبداللہ اسے پڑھتے نہیں تھے، اور کہتے تھے کہ وہ دونوں سورہ کتاب سے نہیں ہیں،

قسطلانی نے شرح بخاری میں نخعی کی ایک روایت نقل کی ہے:۔

واخرج عبداللہ بن احمد فی زیادات المسند والطبرانی وابن رادویہ من طریق الاعمش عن ابی اسحاق عن عبدالرحمٰن بن یزید النخعی قال کان عبداللہ

عبداللہ بن احمد مسند کی زیادات میں تخریج حدیث کی ہے اور طبرانی اور ابن رادویہ نے اعمش کی سندوں سے ابو اسحٰق کے حوالے اور عبدالرحمٰن بن یزید النخعی سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود معوذتین کو

بن مسعود یحک المعوذتین من مصاحفہ ویقول انہما لیستا من القرآن او من کتاب اللہ (عینی شرح بخاری)

اپنے مصحف سے مٹا دیتے تھے، اور کہتے تھے کہ وہ دونوں قرآن میں نہیں یا کتاب اللہ میں سے نہیں ہیں،

علقمہ کی روایت یہ ہے :۔

قال حدثنا الازرق بن علی ثنا حسین ابن ابراہیم ثنا الصلت بن بھرام عن ابراھیم عن علقمۃ قال کان عبد اللہ یحک المعوذتین من المصحف ویقول انما امر رسول اللہ ان یتعوذ بھما ولم یکن عبد اللہ یقرء بہما

ہم سے ازرق بن علی نے، انھوں نے کہا کہ ہم سے حسین بن ابراہیم نے روایت کی اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سے صلت بن بہرام نے اور ان سے ابراہیم نے اور ابراہیم نے علقمہ سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ معوذتین کو مصحف سے مٹا دیتے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس سے تعوذ کیا جائے،

تفسیر ابن کثیر اور قسطلانی شرح بخاری کی ایک روایت یہ ہے :۔

واخرج الطبرانی عن ابن مسعود ان النبیؐ سئل عن ھاتین المعوذتین فقال قیل لی فقلت فقولوا کما قلت (در منثور)

عبد اللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے طبرانی نے تخریج کی ہے کہ رسول اکرمؐ سے ان دونوں معوذتین کے متعلق دریافت کیا گیا، پس آپ نے فرمایا کہ مجھ سے بھی یہی کہا گیا، پس میں نے کہا اس لئے تم بھی کہو جیسا کہ

زر بن جبیش کی روایت یہ ہے

قال حدثنا وکیع ثنا سفیان بن عاصم زر بن جبیش قال سألت عن ابن مسعود عن المعوذتین فقال سألت النبی عنہما فقال قیل لی قل، فقلت لکم فقولوا قال لی فقال النبی فنحن نقول (ابن کثیر)

میں نے ابن مسعود سے معوذتین کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے نبی کریمؐ سے اسکے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ تم کہو، پس میں نے تم سے کہا، اسلئے تم بھی کہو پس ہم بھی کہتے ہیں (اسکی تشریح اگلی حدیث میں آتی ہے)

دوسری روایت یہ ہے :۔ قال الامام احمد حدثنا عفان ثنا حماد بن سلمۃ ابا عاصم بن بھدلۃ عن زر بن جبیش

قال قلت لابی بن کعب ان ابن مسعود لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ، اشھد ان رسول اللہؐ اخبرنی ان جبرئیل قال لہ قل اعوذ برب الفلق

زر بن جبیش سے روایت ہے کہ میں نے ابی بن کعب سے کہا کہ ابن مسعود معوذتین کو مصحف میں نہیں لکھتے تھے، میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ نے مجھے بتایا کہ جبرئیل نے ان سے معوذتین پڑھنے کو کہا تو میں نے دونوں

فقلتھا قال قل اعوذ برب الناس فقلتھا فنحن نقول ما قال النبیؐ (ابن کثیر، مسند امام احمد)

سورتوں کو پڑھا، تو ہم بھی وہی کہتے ہیں جو نبی کریمؐ نے کہا،

تیسری روایت یہ ہے : عن سفیان بن عیینۃ ثنا عبدۃ ابی لبابۃ وعاصم بن بھدلۃ انھما ..عن زر بن جبیش قال سألت ابی بن کعب عن المعوذتین فقلت یا ابا المنذر ان اخاک ابن مسعود یحک المعوذتین من المصحف فقال انی سألت رسول اللہؐ قال قیل لی فقلت فنحن نقول کما قال رسول اللہؐ (مسند ابوبکر بن حمیدی)

ابی بن کعب سے معوذتین کے متعلق میں نے دریافت کیا پس میں نے کہا اے ابو المنذر تمھارے بھائی ابن مسعود معوذتین کو اپنے مصحف سے مٹا دیا کرتے تھے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ سے دریافت کیا تھا تو آپ نے فرمایا مجھ سے کہا گیا ہے، میں نے اسے کہا پس ہم بھی ویسے ہی کہتے ہیں جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا

چوتھی روایت :۔ حدثنا علی بن عبد اللہ ثنا سفیان ثنا عبدۃ ابی لبابۃ عن زر بن جبیش قال سفیان وحدثنا ایضاً عاصم عن زر

قال سألت ابی بن کعب فقلت یا ابا المنذر ان اخاک ابن مسعود یقول کذا وکذا فقال انی سألت النبیؐ فقال قیل لی فقلت فنحن نقول کما قال رسول اللہؐ (بخاری)

میں نے ابی بن کعب سے کہا کہ ابو المنذر تمھارے بھائی ابن مسعود ایسی ایسی بات کہہ رہے ہیں، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے نبی کریمؐ سے دریافت کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا ہے تو میں نے بھی کہا، تو اب ہم کہتے ہیں جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا۔

اس پر مولانا رحمانی کی تنقید حسب ذیل ہے :۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تینوں راویوں میں سے صرف عبد الرحمن ابن مسعود کا قول (انھما لیستا من کتاب اللہ) نقل کرتے ہیں، اور دوسرے راوی نقل نہیں کرتے، عبد الرحمن چونکہ اس روایت میں منفرد ہیں، اور یہ روایت احادیث متواترہ کے خلاف ہے، اس لیے ان کی روایت قابل قبول نہیں، عبد الرحمن سے راوی ابو اسحٰق ہے، جس کے متعلق میزان الاعتدال کی روایت ہے کہ وہ اہل کوفہ سے صحیح روایت نہیں کرتا۔ ابو اسحٰق سے راوی اعمش ہیں جو بقول میزان الاعتدال مدلس ہیں، اور انکی حدیثوں میں بہت اضطراب ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ابن مسعودؓ صحابہ میں ممتاز، فاضل اور ذی کمال صحابی ہیں، کوفہ میں دار العلوم انہی کا تھا، ان کے ہزاروں شاگرد تھے، مگر ان شاگردوں میں سے کوئی بھی یہ روایت نہیں کرتا، بلکہ شاگردوں کی جو روایتیں ہیں وہ اس کے برخلاف، حضرت ابن مسعودؓ قرآن کا درس مع معوذتین دیتے تھے، ان میں ایک روایت جس کی سند بہت عمدہ ہے، در منثور میں حسب ذیل ہے: واخرج الطبرانی ...... ابن مسعود عن النبیؐ قال لما نزل علی آیات لم ینزل مثل من المعوذتین۔ اگر بالفرض ابن مسعودؓ نے انکار کیا ہوتا تو یہ ایک مہتم بالشان قضیہ ہوتا اور تواتر سے لوگ اس کی روایت کرتے، علاوہ ازیں معوذتین کے متعلق صحاح میں متواتر روایتیں ہیں،

علقمہ کی روایت میں ایک راوی ارزق بن علی ہیں، جو غریب حدیثوں کی روایت کرتے ہیں، اور صحاح میں ان سے روایت نہیں کی گئی، دوسرے حسین بن ابراہیم ہیں جو امام نسائی کے نزدیک قابل وثوق نہیں، تیسرے الصلت بن ابراہیم ہیں، جن سے صحاح میں روایت نہیں کی گئی،

زر بن حبیش کی روایت میں اضطراب اور اختلاف ہے، ابن کثیر کی روایت میں زر کا بیان ہے کہ معوذتین کو میں نے ابن مسعود سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے انھیں رسول خدا سے دریافت کیا تھا، آپ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ انھیں پڑھو، میں نے بھی انھیں پڑھا ہے، اس لیے تم بھی پڑھو، پھر زر نے ابی سے دریافت کیا، ابی نے بھی بعینہ یہی جواب دیا،

دوسری روایت امام بخاری نے علی بن عبد اللہ کے واسطہ سے نقل کی ہے، اس میں زر نے ابی سے محض عبد اللہ کا قول نقل کیا ہے، لیکن اس قول کی کچھ تفصیل نہیں ہے، صرف اس قدر ہے کہ ابن مسعودؓ فلاں فلاں بات کہتے ہیں، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زر نے وہی مقولہ نقل کیا ہوگا جو امام احمد نے وکیع کے واسطے سے بیان کیا ہے،

ابوبکر حمیدی کی روایت میں: یحك المعوذتین من المصحف اور چوتھی میں لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ۔ دونوں بیان مختلف ہیں۔

(باقی)

قائم کا انفرادی رنگ

از ڈاکٹر محمد عرفان صاحب لکچرار شعبۂ اردو شبلی کالج اعظم گڈھ

قائم کا انفرادی رنگ معلوم کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انفرادیت کے کیا معنی ہیں؟ شاعری کی حقیقت کیا ہے؟ شاعر کا فرض کیا ہوتا ہے؟ شاعری کی تمام اصناف میں سے کونسی صنف انفرادی رنگ ظاہر کرنے کے لیے مناسب ہوتی ہے؟ انداز بیان سے انفرادیت کیسے نمایاں ہوتی ہے؟

انفرادیت کی مختصر اور جامع تعریف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ انفرادیت شخصیت کا وہ پرتو ہے جو شاعر کے افکار اور اس کے کلام میں جھلکتا ہے، اگرچہ شاعر اپنے سماجی ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے، لیکن اس میں شعور و ادراک کی قوت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے، اور اس کا انداز بیان انفرادی ہوتا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر اپنے سماجی ماحول سے متاثر ضرور ہوتا ہے، لیکن اس میں شعور و ادراک کی قوت عام انسانوں سے زیادہ اور اس کی شخصیت بھی عام انسانوں سے زیادہ ترقی و تربیت یافتہ ہوتی ہے، اسلیے ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود اس کی شخصیت کا جلوہ اس کے فن میں نظر آتا ہے، اور وہ اپنے کلام میں پچھلے تمام رنگوں کو ملا کر ایک نیا رنگ ترکیب دیتا ہے، اور اس ترکیب و تشکیل میں اس کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے، اس طرح گویا ماضی کی صالح روایتوں کو اپنی شخصیت اور ذوق کی مناسبت سے ایک نئی ترتیب دینے کا نام انفرادیت ہے،

نیاز فتحپوری[1] نے شاعری کی یہ جامع تعریف کی ہے "شاعری حقیقت نہیں بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے، صداقت نہیں بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے"

[1] انتقادیات حصہ اول ص ۲۱

اختر اورینوی[1] نے لکھا ہے: "شاعری مذہب ہے، لہذا اس میں ایمان بالغیب کا عنصر زیادہ ہوتا ہے"۔ شاعری کو بھی قلب مومن کی ضرورت ہے، جو بلیؔ "کہنے کے لیے لب کشا ہو، اگر کوئی شاعر دل کو نہیں بلکہ دماغ کو مخاطب کرتا ہے تو وہ آئینہ کو چھوڑ کر سنگ خارا میں اپنی صورت دیکھنے کی حماقت کرتا ہے،

واقعی شاعری کا تعلق دل سے زیادہ ہے اور دماغ سے کم ہے کیونکہ شاعری جذبات کی ترجمانی کا نام ہے[2]، لیکن ایک شاعر کا فرض صرف جذباتِ دل کی ترجمانی کرنا نہیں ہے، بلکہ بقول شیخ محمد اکرام "شاعر کا کام عقائد کو بدلنا نہیں بلکہ تخیل کی صحیح تربیت اور ضیافت دل و دماغ ہے"۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے راز جو ذاتی احساسات اور مشاہدات کا عطیہ ہیں، اگر ان کا نچوڑ حقایق اور فلسفے کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں، جب تک تخیل کی نشو ونما اور روح کی تربیت اس شعوری بلندی تک نہ ہو گئی ہو، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شاعر کا فرض صرف جذبات دل کی ترجمانی ہی نہیں ہے بلکہ ضیافت دل و دماغ ہے، اور شاعر اسی کے لیے طرح طرح کے اصناف سخن میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے، ایک شاعر اپنے فن کا مظاہرہ کبھی قصیدے میں کرتا ہے تو کبھی مثنوی میں اور کبھی غزل میں، لیکن غزل شاعر کے انفرادی رنگ کو ظاہر کرنے کے لیے زیادہ ضروری ہے،

مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں: "غزل کے علاوہ اور شاعری کی جتنی صنفیں ہیں وہ سب مقامی رسم و رواج اور ملکی خصوصیتوں کے بیان سے بھری پڑی ہیں"[3]، اس کے معنی ہیں کہ غزل کے علاوہ اور دوسری صنفوں میں خارجیت کا دخل زیادہ ہے، غزل میں داخلیت زیادہ ہے، اسی بنا پر اس میں شاعر کی شخصیت زیادہ اپنا جلوہ دکھلاتی ہے، شاعر کی شخصیت اس کے طرز یا اسٹائل میں نمایاں ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ شاعری میں معنویت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن وہ طرز یا اسٹائل ہی کی دلکشی اور حسن آفرینی ہے جو شاہد معنی کے رخسار کا غازہ اور عروسِ سخن کا زیور بنکر

---

[1] تحقیق و تنقید ص ، [2] غالب نامہ ص ۳۰، [3] اردو شاعری ص ۱۹۲

اس کی رعنائیوں کو دوبالا کر دیتی ہے، اس طرز یا اسٹائل کو کچھ دوسرے لوگ لب و لہجہ یا انداز بیان کے نام سے پکارتے ہیں، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ طرز یا اسٹائل یا لب و لہجہ کیسے بنتا ہے، شاعری میں لب و لہجہ کئی چیزوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، سب سے زیادہ لب و لہجہ پر شاعر کی شخصیت کی گونج اثر انداز ہوتی ہے، اس کے زندگی بسر کرنے کا انداز (Attitude) اثر ڈالتا ہے، اخلاص، تجربہ اور کمال، زبان دانی دونوں مل کر جاندار اور سچے لب و لہجہ پیدا کرتے ہیں، غرض انداز بیان کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس میں موضوع کا انتخاب، احساس کی شدت، ادبی خلوص طرز فکر اور تاثیر سبھی منزلیں آتی ہیں، تاثیر سے لیکر اظہار تک ان میں سے کسی کو علحدہ کر دیجئے تو انداز بیان کی نشو و نما اور ترتیب کا شیرازہ بکھر جائے گا، یہی موضوع اور طرز بیان نفیس مضمون اور اسٹائل کا سنگم ہے۔

پروفیسر احتشام حسین[1] نے بھی انھی باتوں پر زور دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "شاعری نئے اسلوب میں ہو یا پرانے، شاعر کے لیے اپنے مواد پر قدرت، اس سے خلوص، احساس کی شدت کے ساتھ زبان پر قدرت کی بھی ضرورت ہے، اسے رنگ و صوت، نغمہ و ترنم کی ان تمام لطافتوں سے کام لینا ہے جس سے مواد، دل و دماغ پر چھا جائے اور سننے والے میں عمل کی طاقت پیدا کر دے، مواد اور ہیئت کے اسی اتحاد کا نام فن ہے"۔ پروفیسر آل احمد سرور[2] نے لکھا ہے "اچھی غزل کہنا بڑا مشکل کام ہے، اور اچھی غزل کہنے کی قدرت بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے، اس میں اتنی جانی پہچانی آوازیں ہیں کہ کسی نئی آواز کا پہچاننا مشکل ہے"،

اس لیے قائم کی انفرادی آواز کو بھی غزل میں پہچاننا بڑا مشکل ہے، اس لیے ہم پہلے ان تمام تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی رائے پیش کریں گے جنھوں نے قائم کے کلام پر تنقید کی ہے،

---

[1] تنقیدی جائزے ص ۲۵، [2] تنقید کیا ہے ص ۱۳۴

پھر ان کی روشنی میں قائم کے انفرادی رنگ کو متعین کریں گے۔

سید فتح علی گردیزی[1] لکھتے ہیں: "قائم تخلص شعرش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ"۔

مصحفی[2] جو قائم کے ہمعصر تھے ان کی رائے ہے "فقیر او را در ایام ذو موی بالباس درویش در سرکار نواب محمد یار خاں کہ در آں روزہا تازہ وارد بودہ دیدہ در پختگی کلام چیستی مصراع غزل و ردیہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد راہ میرود و بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید"۔ مرزا لطف[3] دہلوی رقمطراز ہیں:- "سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے، طوطی کو قرار تلخ گفتاری کا سامنے اس شیریں مقال کے اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اس نازک خیال کے صفائے بندش سے اس کی آئینہ کو طلب صفائی وام اور خجالت سے اس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام"۔ میر حسن[4] دہلوی لکھتے ہیں "نخل حدیقۂ فصاحت و غنچۂ بوستان بلاغت شمع بزم سخندانی چراغ خانۂ نکتہ دانی ترقی فکرش دائم بیخ محمد قائم ست عزیست خوشگو شاہین طبعش تیزبال و شہباز فکرش باوج کمال خوبی اشعارش چوں حسن محبوباں دلپذیر در ربط الفاظش مسلسل مانند زلف خوباں بے نظیر"۔ عبدالغفور[5] نساخ نے لکھا ہے: "شاگرد میر درد و سودا شعر خوب کہتے تھے"۔ قدرت اللہ صدیقی[6] نے لکھا ہے:

"نہایت پرگو و خوش مقال و در فنون سخنوری باکمال از خوش خیالان زمان و بلند فطرتان جہاں فکر صایب دارد و در نازک خیال و معنی یابی داد سخنوری میدہد"۔ حکیم ابوالقاسم[7] نے اس طرح لکھا ہے: "قرار داد مخلص کلام از بہار در گذشتہ و چشم از حق ناپوشیدہ می گویم کہ وے رحمۃ اللہ تعالیٰ

---

[1] تذکرہ ریختہ گویان قلمی ص ۱۳۳ [2] تذکرہ ہندی ص ۱۷۹ [3] گلشن ہند ص ۱۳۳ [4] تذکرہ شعرا ۱۱۱ دوص ۵ [5] سخن شعرا ص ۱۸ [6] طبقات الشعرا ص ۳۰ [7] مجموعہ نغز ص ۱۸۲

شاعر بودے فصیح زبان شیریں بیان فصاحت آئین بلاغت آگین صاحب گفتار استوار مالک اشعار آبدار بلبل خوشنوا عندلیب داستاں سرا"۔ گارساں دی تاسی[1] اپنے خطبات میں لکھتا ہے: "شاعری کی حیثیت سے قائم اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں خیال کیا جاتا ہے، بقول کمال سوائے سودا کے جو ہندی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہے، وہ سب سے بڑھا ہوا ہے"۔

مسٹر ایف فیلن اور مولوی کریم الدین نے یہاں تک لکھ دیا ہے[2]: "عجب طرح کا شاعر خوش گفتار بلند مرتبہ، موزوں طبع، عالی مقدار ہے کہ اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ شخص اس مرتبہ کا ہے کہ دیوان دیکھنے سے اس کی قدر کھلتی ہے، بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں، حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعض کم مایہ اور بے استعداد جو اس کو برابر سودا کے کہتے ہیں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ آگ رشک میں جلتے ہیں کیونکہ مثل اس کے شعر کہہ نہیں سکتے، خصوصاً قطعات و رباعیات اس کے ایسے ہیں کہ باریک بیں آدمیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، جب اس کو مطالع کرتے ہیں"۔ شیفتہ[3] کی رائے ہے کہ "شاعریست خوش گفتار، بلند پایہ موزونیت عالی مقدار گرانمایہ .... بہم حال قائم در سخن دستگاہے دل پسند دارد"۔

نواب ابراہیم خاں بہادر[4] لکھتے ہیں "بخوش خیالی و شیریں مقالی موصوف و در معاصرین خویش بسلامت ذہن و استقامت طبع معروف است"۔ لچھمی نرائن شفیق[5] اورنگ آبادی نے صرف اس پر اکتفا کیا ہے "ذہن سلیم و فکر مستقیم دارد اشعار آبدارش معنوی لطافت و افکارش حاوی ملاحت"۔ محمد حسین آزاد[6] کی رائے ہے "یہ صاحب کمال چاند پور کے رہنے والے تھے، مگر فن شعر میں کامل تھے، ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے"۔ آزاد کی رائے کو نقل کرتے ہوئے عبدالشکور شیدا[7] نے لکھا ہے "دیوان کی نسبت آزاد کی رائے ہے کہ میر و مرزا کے دیوان سے نیچے

---

[1] خطبات دی تاسی ص ۷۷، ۷۸، ۷۹ [2] طبقات الشعرا ہند قلمی ص ۱۵۶ [3] گلشن بے خار ص ۲۰۶ [4] گلزار ابراہیم قلمی ص ۱۶۷ [5] چمنستان شعرا ص ۱۰۱ [6] آب حیات ص ۱۹۰ [7] فٹ نوٹ ٹ بینتی

نہیں رکھ سکتے، کلام جو دیکھنے میں آیا اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے"۔ مولانا عبدالسلام ندوی[۲]
لکھتے ہیں "قائم نے جیسا کہ مصحفی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی
کی ہے، لیکن ان کو غزل اور مثنوی سے زیادہ مناسبت ہے، قطعات و رباعیات میں بھی وہ یگانہ
خیال کیے جاتے ہیں"۔ محمد مبین[۳] کیفی چریاکوٹی نے لکھا ہے "قائم باکمال اور نازک خیال سخنور تھے،
ان کی فکر رسا، فطرت بلند اور طبیعت معنی یاب تھی، مضمون آفرینی اور قادر الکلامی میں میر
اور سودا کے قریب پہنچ جاتے ہیں"۔ سید راس[۴] مسعود نے لکھا ہے "انکا شمار ریختہ کے استادوں
میں ہے، سلاست اور صفائی ان کا حصہ تھی، ان کے بعض اشعار ضرب المثل کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں"۔
شوق[۵] رامپوری نے لکھا ہے "در ریختہ گوئی در تمام ہندوستان مشہور و معروف بود، دیوان ہندی
او شہرت دارد از سخنوران کامل در زبان ریختہ بود"۔ حکیم سید احمد علی یکتا رقم طراز ہیں[۶]: "چہارم
از طبقۂ اول رستم میدان شاعری سہراب معرکۂ سخنوری، افراسیاب مملکت سخن طرازی، دارائے
سلطنت نکتہ پردازی، مقدم گروہ شعراء نامی میر و مرزا شیخ قیام الدین علی المتخلص بقائم کہ غزلش
نیز محمد قائم بودہ شاعرے گذشتہ باقوت و تمکین کلامش پرمزہ و بنہایت متین، دیوانش سراسر انتخاب
و اشعار دلپذیرش مثل لآلی آبدار ہمہ باآب و تاب تالیف کلمات و بندش الفاظ او اگر نگاہ کنند
قدم بقدم مرزا است و از برجستگی و شگفتگی آں اگر گفتہ آید بے شبہہ با میر ہم ادا است حق این است
کہ با کلام لطافت انجام ایں سخن طراز ہیچ وجہ از کسے فروتر نیست عجب طرز لطیف وضع لطیف
اختیار کردہ کہ لطف و کیفیت بر در استادان را شامل بلکہ بر بعض مقام ترجیح طلب است"۔
حسرت[۷] موہانی نے لکھا ہے کہ "راقم الحروف کی بھی رائے ہے کہ اگر سودا کے برابر نہیں تو ان سے

---

۱ بیاض سخن ص ۴۴ ۲ شعر الہند ص ۱۳۸ ۳ جواہر سخن ج ۲ ص ۲۰۰ ۴ انتخاب زریں ص ۱۷
۵ تکملۃ الشعرا ۴۴۲ الف ۶ دستور الفصاحت ص ۴۳ و ۴۴ ۷ اردوئے معلی جنوری ۱۹۰۳ء ص

کچھ بہت نیچے بھی نہیں ہے، یہ رائے سودا کی کوشش اصلاح زبان اور ان کے فیض سخن کے لحاظ سے قائم
کی گئی ہے، ورنہ استادی سے قطع نظر کرکے قائم کی شاعری سودا کی شاعری کے ضرور برابر ہے"۔ لیکن
مولانا عبد الحق[۱] کی رائے ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ قائم بہت بڑا شاعر ہے، لیکن اسے میر اور مرزا
کا ہم رتبہ کہنا سراسر ناانصافی ہے، اس کا کلام ہر صنف میں موجود ہے"۔ سید صاحب رضا کی رائے ہے:
ایسی مشق بہم پہنچائی کہ ان کے طرز ادا کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، آپ کی خوش بیانی
اور قادر الکلامی نے اسی قدر شہرت حاصل کی کہ آپ ایک مسلم الثبوت استاد مانے گئے"۔ مجنون[۳]
گورکھپوری لکھتے ہیں "قائم کی اصل شان ان کا تغزل ہے، اور اسی کی بدولت وہ غیر فانی رہیں گے"۔
نثار احمد[۴] فاروقی کی رائے میں "قائم چاندپوری عہد میر و مرزا کے بڑے پختہ گو مشاق اور ماہر فن
شاعر تھے، ان کی نغز گوئی اور شیوہ بیانی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں کسی طرح میر اور
مرزا سے کم نہ تھے"۔

ان تمام تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی رائے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قائم بلاشبہ ایک
ماہر فن شاعر تھے، اور اپنے عہد کے دوسرے استادوں مثلاً میر اور مرزا سے کسی طرح کم نہ تھے،
مگر وہ ایک خاکسار انسان تھے، اور خاکساری میں یہاں تک کہہ دیا ہے

کیوں نہ واہی ہو شعر قائم کا ہے وہ آنے کی آخرش تصنیف

لیکن اس خاکساری کے باوجود ان کو اپنے فن کی پختگی پر ناز تھا، اور یہ احساس تھا کہ وہ عندلیب
خوش آہنگ ہیں، اور زمانے کی ناقدری نے ان کو زاغ و زغن کے ساتھ ہم قفس کر دیا ہے۔

قائم میں عندلیب خوش آہنگ تھا پہ حیف زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

---

۱ مقدمات عبد الحق حصہ اول ص ۲۰۷ ۲ نگار اگست ۱۹۲۸ء ص ۲۸ ۳ تنقیدی حاشیے ص ۹۲ ۴ یادور دسمبر ۱۹۵۹ء ص ۱۸

ان کو اپنے فن پر مکمل عبور حاصل تھا، اکثر جگہ انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے

جیسے بھی قائم کے ہو کیونکر سخن یاروں کا سبز — آگے بلبل کے کبے آتی ہے خوش فریاد زاغ

موتی صدف سے نکلے ہیں قائم کب اس طرح — ڈھلتی ہے بات منہ سے ترے جس صفا کیساتھ

یہی نہیں بلکہ ان کو مکمل اعتماد و احساس تھا،

میرا سا لب و لہجہ کہاں مرغ چمن میں — گل کترے ہوں سو رنگ سے میں طرز سخن میں

قائم جو اعتبار سے رتبہ کے دیکھئے — کم آسماں سے شعر کی تیرے زمیں نہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ طرز سخن میں سیکڑوں رنگ سے گل کترتے ہیں، کبھی میر تقی میر کا رنگ اختیار کرتے ہیں، کبھی مرزا رفیع سوداؔ کی روش پر چلتے ہیں، اور کبھی خواجہ میر دردؔ کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں، اور ان کا کمال یہ ہے کہ ہر رنگ میں کامیاب نظر آتے ہیں، اس لیے ان مختلف رنگوں میں خود ان کے انفرادی رنگ کا پتہ ذرا مشکل سے چلتا ہے، لیکن انہی رنگوں میں ان کا اپنا انفرادی رنگ بھی ہے، جس طرح جلوؤں کی کثرت میں بھی ایک وحدت پوشیدہ ہوتی ہے، اور اہل نظر اس کو معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح باریک بین نگاہیں قائم کے رنگ کو بھی معلوم کر لیتی ہیں، خود قائم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے

شعر قائم کے ہم نے آج سنے — ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

اس لیے اگر غور سے قائم کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے انفرادی رنگ کا اندازہ ہو سکتا ہے،

اس کی خصوصیات کے بارہ میں مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں[1] "قائم کا سارا کلام دیکھ جانے کے بعد اتنی خصوصیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں، وہ جو باتیں کہتے ہیں وہ بہت جامع اور ہمہ گیر اور عام فہم ہوتی ہیں، لیکن عامیانہ نہیں ہوتیں، ان کی زبان میں ایک پرکیف سادگی ہوتی ہے اور

[1] نکاتِ مجنوں ص ۳۰،

بیان میں ایک بالکل اپنے انداز کی بے ساختگی، ان کی شاعری جذبات کی اس منزل سے ہوتی ہے جہاں انسان کے اعصاب میں انقباض باقی نہیں رہتا ...."

حقیقۃً اور بڑی حد تک قائم میں یہ خصوصیات ہیں، میر جیسا بلند پایہ استاد بھی جب پستی پر اتر آتا ہے تو مبتذل اشعار کہتا ہے، مگر قائم کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ معمولی مضامین میں بھی عامیانہ پن نہیں آنے دیتے، قائم کی اس خوبی میں اگر ان کا کوئی مقابل ہے تو وہ خواجہ میر درد ہیں، قائم کے کلام میں عشق کے لوازمات میں نالہ و فریاد بھی ہے، گریہ و بکا بھی، زحمتِ انتظار بھی رقابت بھی، وعدہ و پیغام بھی نامہ بر بھی، لیکن انھوں نے ان سب مضامین میں عام شعراء کے پامال راستے کو چھوڑ کر اپنی راہ الگ نکالی ہے اور ہر مضمون کو پستی و ابتذال سے نکال کر اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے"

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نالہ و فریاد: نے نالے میں تاثیر ہے نے آہ میں یاں درد — معلوم ہو کس طرح تجھے چاہ کسی کی

ویسی ہی آہ وہی نالہ ہے — اب بھی یاں فضلِ حق تعالیٰ ہے

گریہ و بکا: مانعِ گریہ کس کی خو ہے کہ آج — آنسوؤں سے بہا نہیں جاتا

رقابت: خدا نکردہ اسے غیر سے تو کیا سروکار — تھی ایک ہی بات ہمارے ہی جلانے کی

نامہ و پیام: نہ پہنچا کان تک اس جنگ جو کے حال مرا — خدا بھلا کرے نامے کی نارسائی کا

بوسہ کے مضامین میں اعتدال قائم رکھنا بہت مشکل ہے، اس لیے اکثر شعراء نے اس راہ میں ٹھوکر کھائی ہے، مگر قائم نے اپنی انفرادیت اس میں بھی قائم رکھی ہے،

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی ہے کیونکر مانوں — ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

یہ اشعار گواہی دیتے ہیں کہ قائم کے جذبات عامیانہ نہ تھے، اور اگر کہیں رواجِ عام کی پابندی میں انھوں نے کوئی پامال مضمون یا پست خیال نظم بھی کیا ہے تو اس سلیقے اور صفائی سے کہ

ابتذال کی ہوا بھی اس کو نہیں لگ پائی ہے،

قائم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان میں ایک پُرکیف سادگی اور بیان میں بڑی بے ساختگی ہوتی ہے، سادگی کے لیے میر تقی میر اور خواجہ میر درد بھی مشہور رہیں لیکن قائم کی سادگی میں پُرکاری اور ایسا کیف ہے کہ پڑھنے والے کو بے خود کر دیتا ہے، ان کی بے ساختگی میر تقی میر کے سوز و درد سے ملتی جلتی ہوئی ہوتی ہے، پھر بھی کسی حد تک ان سے مختلف ہوتی ہے، ان کی بے ساختگی بتاتی ہے کہ شاعر نے تجربے کے بعد یہ منزل حاصل کی ہے، اور اس کو عرفان غم کی دولت ہزاروں مصیبتیں جھیلنے کے بعد ملی ہے، اسی لیے اس کا لہجہ ایسا متین اور دھیما ہوتا ہے کہ نوک نشتر کا کام کرتا ہے، مثلاً

غیر اس کے کہ خوب روئیے اور — غم دل کا کوئی علاج نہیں

دل گنوانا تھا اس طرح قائم — کیا کیا ہائے تو نے خانہ خراب

لوٹنا خوں میں گلستاں کی طرح — کہہ تو اے دل یہ ہے کہاں کی طرح

نے ہجر چاہتا ہوں نہ وصل حبیب کو — یارب کہیں ہو صبر دل ناشکیب کو

سمجھ کے شیشۂ دل کو نہ شکوہ اے بت مست — بجائے بادہ لہو ہے اس آبگینے میں

یہ جانتا میں نہیں ہوں کہ دل ہے کیا قائم — پر اک خلش سی رہے ہے مدام سینے میں

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائم — شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

قائم کی تیسری انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری جذبات کی اس منزل سے شروع ہوتی ہے، جہاں انسان کے اعصاب میں انقباض باقی نہیں رہتا، جہاں غم اور خوشی کی سرحدیں مل جاتی ہیں، جہاں ہر خوشی غم اور ہر غم خوشی معلوم ہونے لگتا ہے، جہاں انسان اپنی ذات سے بے تعلق ہو کر کہہ سکتا ہے

یار اگر چاہتا ہے دے قائم — جان کچھ دل سے تو زیاد نہیں

ایسی سپردگی اور رضا جوئی کی منزل بغاوت اور سرکشی کی منزل سے کہیں بلند ہے، ایسے سکون میں ہزاروں طوفانوں کا خروش جھلکتا ہے، ایسی حالت جب پیدا ہوتی ہے کہ دل کی شورش میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہونے لگتا ہے، اور جذبات میں قرار و سنجیدگی کے آثار رونما ہونے لگتے ہیں، قائم اس بلندی سے شاعری کرتے ہیں، ان کے اشعار عام طور پر جذبات کی اسی منزل سے ہوے ہیں، جہاں شاعر کو زندگی کی بصیرت حاصل ہو چکی ہوتی ہے، اور دنیا اس کے بازیچۂ اطفال کی طرح معمولی ہوتی ہے، قائم کا یہی ضبط و ٹھہراؤ انکی آواز کو دوسرے شاعروں کی آواز سے ممتاز کرتا ہے، ملاحظہ ہو:-

مانع گریہ کس کی خو ہے آج — آنسوؤں سے بہا نہیں جاتا

نت ہوں قائم خموش کیا جانے — کس تہی دست کا چراغ ہوں میں

کل اے آشوب نالہ آج نہیں — آج ہنگامہ پر مزاج نہیں

جب میں دیکھا ہے تو اس دل کو غمیں دیکھا ہے — یہ نیا جادۂ محبت کا نہیں دیکھا ہے

خشک و تر پھونکتی پھرتی ہے سدا آتش عشق — بچیو اس رنج سے اے پیر و جواں سنتے ہو

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری — مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

ایک جا گر یہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں — ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں

کھل گیا آپی آپ کچھ قائم — کیا بلا اس جوان پر آئی

ان خصوصیات کے علاوہ قائم کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان کا کلام ایک دھن میں ہے، ان کے آہنگ میں تنوع بہت ہی کم ہے اور یہ آہنگ سوز و گداز کا آہنگ ہے، جو شروع سے آخر تک ان کی شاعری میں ملتا ہے یہی ان کی سب سے بڑی انفرادی

خصوصیت ہے جو ان کی شاعری کی نمایاں خوبی ہے، اور ایک حد تک خامی بھی، خوبی اس لیے ہے کہ اس آہنگ کی بنا پر قائم کا کلام دوسرے شعراء کے کلام سے ممتاز نظر آتا ہے، اور خامی اس لیے ہے کہ اسی آہنگ کی بنا پر ان کی شاعری میں یکسانیت پیدا ہوگئی ہے، جو پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قائم کی شاعری اتنے عرصے تک گمنامی کے غار میں پڑی رہی، ان کے یہاں مہذب اور تربیت یافتہ تلخی بھی پائی جاتی ہے، جو ان کے کلام میں ایک والہانہ انداز وارفتگی پیدا کر دیتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں — یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

دل دے کے دیا ہے تجھ کو جاں تک — اب اور جگر کروں کہاں تک

یارب گیا کون یاں سے مہماں — لگتا ہے یہ گھر اداس مجھ کو

دل مژہ تک پہنچ چکا جوں اشک — اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہے

آنا ہے تو آ کو گر نہ پیارے — ہم آپ سے آج جا رہے ہیں

ہم سے ملے نہ آپ تو ہم بھی نہ مر گئے — کہنے کو رہ گیا یہ سخن دن گذر گئے

نہ جانے کونسی ساعت چمن سے بچھڑے تھے — کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے — بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ

میں دوانہ ہوں صدا کا مجھے مت قید کرو — جی نکل جائیگا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

قائم کی ایک اور خصوصیت کی طرف حکیم سید احمد علی یکتا[1] نے اس طرح اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"ذوق بندش، قصیدہ از غزل و غزل از رباعی و رباعی از دیگر اقسام در کلیات ہمیں صاحب انداز از ہم متمیز چہ ہر قسم کہ گفتہ آں را از حدش ہرگز متجاوز شدن نہ دادہ بہ بہا انداز کردے را می بایست نگاہ داشتہ است"۔

قائم نے ہر صنف کو اس کی حد میں برتا ہے، اکثر استادوں کے یہاں یہ کمی ملے گی کہ وہ قصیدے کو غزل سے اور غزل کو رباعی سے متمائز نہیں کر پاتے، لیکن قائم کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، مگر ہر ایک کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے، جس صنف کے لیے جو انداز مناسب ہے اسی کو اختیار کیا ہے، قائم اپنی اسی حقیقت اور اعتدال پسندی کی بنا پر ہر صنفِ سخن میں کامیاب نظر آتے ہیں، ان کی غزلوں میں تغزل ہے، تو قصیدوں میں شان و شوکت و زور بیان اور مثنویوں میں سادگی، سلاست، روانی اور تسلسل ہے، غرض ہر صنفِ سخن کی مقتضیات کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔

[1] دستور الفصاحت ص ۴۵

شعر الہند حصہ اول

اس میں قدماء کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے

(مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم)

صفحے ۴۹۴ قیمت للعہ

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اردو شعراء کا یہ پہلا اور مکمل تذکرہ ہے جس میں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات ا

مولفہ مولانا عبد الحئی مرحوم

صفحات ۵۴۸ قیمت للعہ

خیام کا قدیم ترین تذکرہ

از

جناب ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، ایم، اے، ایل ایل، بی (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن)

مجلہ معارف اعظم گڈھ نمبر ۴، ۵، جلد ۹۰ بابت ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۲ء صفحات ۲۸۴، ۳۷۶ میں "خیام کا قدیم ترین تذکرہ" پر جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری، ایم اے، ایل ایل، بی، بی ٹی ایچ رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش نے جو مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے، وہ نظر سے گذرا، اس مقالہ میں فاضل مقالہ نگار نے میرے مقالہ مطبوعہ اسلامک کلچر جنوری ۱۹۶۰ء پر جو تبصرہ فرمایا ہے، اسکا انداز بیان متانت و سنجیدگی سے گرا ہوا، اور ایک عالم کی شان کے سراسر خلاف ہے، میرے مضمون کو انھوں نے "بے سروپا" "خیال آرائی" اور "سخن پروری" قرار دیا ہے، حالانکہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ یورپی، ترکی، ایرانی وغیرہ کتب خانوں میں بچشم خود دیکھے ہوئے مخطوطات پر مبنی ہے، نہ کہ سماعی اور سکنڈ ہینڈ معلومات پر، کیونکہ تتمہ صوان الحکمۃ کا کوئی مخطوط ہندوستان کے کسی کتبخانہ میں موجود نہیں ہے، میں تبصرہ و تنقید میں طعن و تشنیع کے طریقہ کو معیوب سمجھتا ہوں، اس کے لیے صرف علمی جواب کافی ہے، اس سے انکار نہیں کہ سہو و اغلاط انسان سے سرزد ہوتے ہیں، اور کسی کی تحقیق حرف آخر نہیں کہی جاسکتی، لیکن اس زمانہ کے لیے وہ "نئی دریافت" ضرور ہوتی ہے، اس پر طعن و طنز اہل علم کے شایان شان نہیں،

یہ واقعہ ہے کہ لندن سے برلن جاتے ہوئے میں نے علامہ مرزا محمد قزوینی سے پیرس میں چند

ملاقاتیں کی تھیں، اور ان سے چہار مقالہ میں عمر خیام کے متعلق محولہ قدیم ترین ماخذ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ چہار مقالہ کے مقدمہ میں مندرجہ عبارت منتخب التواریخ خسرو ابرقوہی سے نقل کی گئی، جس نے نزہۃ الارواح شہرزوری سے نقل کیا تھا، میں نے موصوف سے کہا کہ نزہۃ الارواح سے بھی مقدم تتمہ صوان الحکمۃ مصنفہ ابوالحسن بیہقی ہے، جو اسٹیٹ لائبریری برلن میں موجود ہے، اس پر علامہ نے وہی جملے کہے جو میں نے اپنے سابقہ مضمون مطبوعہ اسلامک کلچر میں لکھے ہیں، یعنی "آن تحقیق من بود و این تحقیق جدید شماست و در التسلیم منکیم"۔ جو لوگ موصوف سے ملے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کس قدر سادہ مزاج اور راست گو تھے، انھوں نے مجھ سے یہ بھی خواہش کی کہ برلن لائبریری کے مخطوطہ تتمہ صوان الحکمۃ سے خیام کا ترجمہ نقل کرکے ان کے لیے بھیجدوں، چنانچہ میں نے اس کی تعمیل کی، اور وہ جملے انہی کے ہیں جو مجھ سے زبانی گفتگو میں میرے برلن جانے سے پہلے کہے تھے۔

اسکے چند سال بعد موصوف نے صوان الحکمۃ سجستانی پر مضمون لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ تتمہ صوان الحکمۃ پر بھی روشنی ڈالی جن میں انھوں نے مزید تحقیق و تدقیق سے کام لیا، اس مضمون کی ایک کاپی خط کے ساتھ میرے نام بھیجی، جس میں عمر خیام وغیرہ کے ترجمہ کی نقل پہنچنے پر میرا شکریہ ادا کیا تھا، افسوس ہے کہ وہ خط باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہوا، ورنہ اس گفتگو پر مزید روشنی پڑتی،

جناب غوری صاحب نے تحریر فرمایا ہے "فاضل مقالہ نویس نے بغیر کسی دلیل کے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ "تتمہ صوان الحکمۃ" ۵۴۹ھ میں اور "چہار مقالہ" اس کے تین سال بعد ۵۵۲ھ میں تالیف ہوا ہے، اور اس لیے اول الذکر ثانی الذکر سے مقدم ہے، اس طرح انکی اس "نئی دریافت" نے اساتذہ قدیم کے نظریات پر خط نسخ پھیر دیا ہے، مگر اس قسم کے دعاوی کچھ

مستحسن نہیں معلوم ہوتے"۔ فاضل ناقد نے ان جملوں میں کئی اعتراضات کیے ہیں، جن کی تفصیل تو آگے آئے گی، یہاں ان کے ہر اعتراض کا جواب مختصراً دیا جاتا ہے۔

مقالہ نویس" کے لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہے، جو بروزن کاپی نویس، قبالہ نویس ہے، جس کا کام اصل تحریر کی نقل کرنا ہے،" نویس" کے عوض" نگار" ہونا چاہیے، جیسے مضمون نگار، مقالہ نگار، وقائع نگار وغیرہ۔

یہ ارشاد کہ بغیر کسی دلیل کے یہ دعویٰ فرمایا ہے"، غلط ہے، میں نے خارجی و داخلی دونوں شہادتیں اپنے مقالہ میں پیش کر دی تھیں، ان دلائل کا اعادہ آگے کیا جائے گا،

فاضل ناقد تحریر فرماتے ہیں" تتمہ صوان الحکمۃ ۵۴۹ھ میں" چہار مقالہ" اس کے تین سال بعد ۵۵۲ھ میں تالیف ہوئے ہیں، اس لیے اول الذکر ثانی الذکر سے مقدم ہے، سنین کے حد تک یہ بدیہی ہے کہ ۵۴۹ھ ۵۵۲ھ سے مقدم ہے، ان سنین کی تقدیم و تاخیر سے کون انکار کرسکتا ہے، معجم الادبا میں تتمہ کا ۵۴۹ھ درج ہے، اور چہار مقالہ مطبوعہ آقائے قزوینی، سنہ تالیف ۵۵۱-۵۵۲ھ ہے،

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں" اس طرح ان کی اس" نئی دریافت" نے اساتذۂ قدیم کے نظریات پر خط نسخ پھیر دیا ہے"، لیکن یہ طنز بالکل بے محل ہے، کیونکہ چہار مقالہ میں خیام کا ذکر نزہۃ الارواح سے مقدم اور تتمہ کا سنہ چہار مقالہ سے مقدم ہو، ہر زمانہ میں نئی دریافت ہوسکتی ہے، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ" تین سال کا عرصہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کی بنا پر متاخرین کی دریافتوں کو متقدمین کے آراء کو نسخ و ابطال کا حق دیا جائے"۔ تین سال تو درکنار تین ماہ یا چند دنوں میں بھی اہم واقعات کا ظہور ممکن ہے، جو مقدم ہے وہ ہر حال میں مقدم رہے گا،" الفضل للمتقدم"۔

حیرت ہے کہ ایک جگہ تو ناقد صاحب علامہ قزوینی کی تحقیق تصنیف چہار مقالہ ۵۵۱-۵۵۲ھ

پر خود خط نسخ پھیر دیتے ہیں، اور دوسری جگہ (۲۹۲) پر اس کے بالکل برعکس فرماتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے" قدما، میں اپنی تصانیف میں تاریخ تدوین ثبت کرنے کا دستور نہ تھا، اس لیے ان کے زمانۂ تصنیف کا تخمینہ بالعموم قرائن ہی کے ذریعہ لگایا جاتا ہے، لیکن یہ قاعدہ کلیہ کی صورت میں صحیح نہیں ہے، قدما کی بیشمار کتابیں ایسی ہیں جن میں تاریخ تصنیف موجود ہے اور خود ابوالحسن بیہقی کی متعدد کتابوں کی تاریخ تصنیف اس کی کتابوں سے دستیاب ہو جاتی ہے۔

اور" ان کے زمانۂ تصنیف کا تخمینہ قرائن ہی سے نہیں لگایا جاتا"۔

مزید فرماتے ہیں" بیشک شہرزوری کی نزہۃ الارواح سے چہار مقالہ اور تتمہ دونوں مقدم ہیں، (موخر الذکر تو نزہۃ الارواح کا ماخذ ہے)، اس جملہ کی تفصیل آگے آئے گی۔

" لیکن تصریحات کے فقدان کی صورت میں چہار مقالہ اور تتمہ صوان الحکمۃ میں تقدیم و تاخیر کا فیصلہ بہت مشکل ہے"، علامہ قزوینی کی تحقیق کے مطابق چہار مقالہ کا سنہ تصنیف ۵۵۱-۵۵۲ھ قرار دیا جاتا ہے، اور ہم نے خارجی اور داخلی شواہد سے تتمہ صوان الحکمۃ کا سنہ تکمیل ۵۴۹ھ قرار دیا تھا۔

جناب شبیر احمد خانصاحب غوری نے بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ میں نے معجم الادبا یاقوت الحموی سے جو عبارت پیش کی ہے اس میں" ہذہ السنۃ" کے بعد ۵۴۹ھ درج نہیں ہے بیشک کاتب سے اتنا تسامح ہوگیا ہے، کہ اس نے سنہ کو قوسین میں نہیں لکھا، جناب نے اتنی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا، اور اسی پر ایک پوری عمارت کھڑی کردی، انھوں نے تو ھا انا اذکر تصانیفی فی ہذہ المدۃ سے پہلے کی پوری عبارت ہی حذف کردی، حالانکہ اسی عبارت کو انھوں نے صفحات ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵ پر کئی مرتبہ دہرایا ہے، اس لیے اگر وہ اس کے اوپر کے چند سطور ایک مرتبہ بھی نقل کر دیتے تو پڑھنے والوں کا مغالطہ دور ہو جاتا۔

ایک جگہ دبی زبان سے صفحہ ۲۹۴ پر یہ اعتراف کیا ہے کہ "اس عبارت کے اوپر ایک جگہ ۵۴۹ھ کا ذکر ضرور آیا ہے" جس طرح انھوں نے "ھا انا اذکر" کا ذکر متعدد مرتبہ کیا تھا، اگر ایک مرتبہ اوپر کی چند سطریں عربی کی نقل کر دیتے تو اتنی خامہ فرسائی اور طبع آزمائی کی ضرورت نہ پیش آتی۔ انھوں نے عمداً عربی کی مذکورۂ بالا عبارت ترک کر کے قارئین کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی،

معجم الادباء مصنفۂ یاقوت الحموی مطبوعۂ مصر ۱۹۱۱ء جلد ۵ ص ۲۰۸ تا ۲۱۸ پر ابوالحسن بیہقی کی تصنیف مشارب التجارب و غوارب الغرایب سے اس کے حالات، تصنیفات و تالیفات منقول ہیں۔ اس سلسلہ میں صفحہ ۲۱۱ کی عبارت یہاں نقل کیجاتی ہے جس سے ناظرین خود اندازہ لگالیں گے کہ اس میں اس کی تصانیف کی جو فہرست ہے وہ ۵۴۹ھ تک کی تکمیل شدہ کتب کی ہے یا اس سے متجاوز ہے۔ اور تتمہ صوان الحکمۃ کی تکمیل اس سنہ تک ہو چکی تھی یا نہیں، اس عبارت سے ہر شخص وہی نتیجہ نکالے گا جو ہم نے نکالا ہے، وہ عبارت یہ ہے:-

فالقیت العصا بنیسابور واقمت	میں نیشاپور میں ٹھہر گیا اور غرۂ رجب ۵۴۹ھ
بہا الی غرۃ رجب سنۃ ۵۴۹ھ	تک یہاں مقیم رہا، پھر اپنی والدہ کی زیارت
ثم ارتحلت عنہ لزیارۃ والدتی	کے لیے روانہ ہوا۔ اسی سنہ میں میرے
ومات ولدی احمد ووالدتی	لڑکے احمد اور میری والدہ کا انتقال
فی ھذہ السنۃ وکانت حافظۃ	ہو گیا، وہ حافظ قرآن اور وجوہ تفسیر
للقرآن، عالمۃ بوجوہ تفاسیرہ	کی ماہر تھیں، اب میں اس مدت تک کی
وھا انا اذکر تصانیفی فی ھذہ[1]	اپنی تصانیف کا ذکر کرتا ہوں،

[1] معجم الادباء، مطبوعہ مکتبہ عیسی البابی الحلبی و شرکائہ بمصر سنہ ۱۹۳۶ء میں سنہ الفاظ میں درج ہے "تسع و اربعین و خمسمائۃ" اور طبع جندیہ موگی مصر کے دونوں اڈیشنوں میں سنہ مذکور ہندسوں میں لکھا ہوا ہے۔

اس عبارت میں پہلے ۵۴۹ھ واضح طور پر درج ہے، اس کے بعد بیہقی نے اپنی والدہ کی زیارت و رحلت اور اپنے فرزند کے انتقال کو "فی ھذہ السنۃ" لکھا ہے، "ھذہ" اشارۂ قریب ہے، اس سے مراد ۵۴۹ھ ہی لیا جائے گا، اس کے بعد کے دوسرے جملے میں لکھتا ہے:- "وھا انا اذکر تصانیفی فی ھذہ المدۃ" اس اشارۂ قریب سے بھی وہی ۵۴۹ھ مراد ہوگا یا کوئی اور سنہ جو کہیں مذکور نہیں؟

دوسری دلیل تتمہ صوان الحکمۃ کے ۵۴۹ھ تک تصنیف کیے جانے کی یہ ہے کہ تاریخ بیہقی اور لباب الانساب جو ۵۴۹ھ تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں، ان کا ذکر اس فہرست میں نہیں ہے، اور یاقوت الحموی کو یہ کتابیں بعد میں ملی تھیں، چنانچہ وہ معجم الادباء جلد ۵ ص ۲۱۳ پر لکھتا ہے:-

قال المؤلف ھذا ما ذکرہ فی مشارب التجارب ووجدت لہ کتاب
تاریخ بیہقی بالفارسیۃ وکتاب لباب الانساب

تاریخ بیہقی کا سنہ تصنیف ۵۶۳ھ ہے، لباب الانساب نایاب ہے اس لیے اسکا سنہ معلوم نہیں،

دوسری داخلی شہادت تتمہ سے یہ ہے کہ بیہقی نے ایک معتدبہ حصہ لکھنے کے بعد آخر حصہ کتاب میں سنہ وار واقعات قلمبند کیے ہیں، چنانچہ ۵۴۴ھ سے ۵۴۹ھ تک کے واقعات مسلسل سنہ وار ہیں، اور اسی سلسلہ میں ۵۴۹ھ کے حالات بھی ہیں، ناقد کی یہ تحریر کہ "مسلسل سنین کے تین سالہ وقفہ کے بعد ۵۵۲ھ کا ذکر تحریف معلوم ہوتا ہے، تین سال کی کوئی اہمیت نہیں" حیرت انگیز ہے، اس لیے کہ تین سال تو کجا تین ماہ بلکہ تین دن کے اندر بھی اہم واقعات رونما ہو سکتے ہیں،

صفحہ ۲۹۵ پر ۵۴۹ھ کے متعلق بھی جناب ناقد کو اعتراض ہے، وہ لکھتے ہیں: "بہت ممکن ہے کہ ۵۴۹ھ کتابت کی غلطی ہو، ایسے اغلاط کتاب میں اور بھی ہیں ...... جس طرح انھوں نے

۵۲۷ھ کو ۵۶۷ھ کر دیا" لیکن ہماری رائے میں ۵۴۹ھ میں غلطی کا امکان نہیں، اس لیے کہ سنہ ہندسوں کے علاوہ الفاظ میں بھی درج ہے (دیکھو معجم الادباء مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء جلد ۱۳ ص ۲۲۴ اور اصل مخطوطہ معجم الادباء جلد خامس مخزونہ کتبخانہ کوپریلی زادہ محمد پاشا استنبول، ان سب میں سنہ تسع واربعین وخمسمائہ تحریر ہے)

اس عبارت میں ناقد صاحب نے لفظ "تصحیف" کا غلط استعمال کیا ہے، تصحیف ہندسوں میں نہیں ہوتی بلکہ دو لفظوں کے نقطے بدل جانے سے ہوتی ہے، جس سے ذم کے معنی پیدا ہوں، جیسے یا بو، بابو وغیرہ تو وہ "تصحیف" کہلاتی ہے (دیکھو آئینۂ بلاغت، سراج البلاغت، اور سہل البلاغت وغیرہ) جناب نے جس سنہ کو چاہا تصحیف وتحریف کہدیا، اگر ہر سنہ میں اسکی گنجائش نکل سکتی ہے تو پھر ابوبکر بن عروۃ کے سنہ وفات کو ۵۵۳ھ کے بجائے ۵۴۳ھ کیوں نہ تصور کیا جائے، جبکہ وفات ۵۴۴ھ تا ۵۴۹ھ کے درمیان واقع ہوتی ہے، اور تتمہ میں اسی جگہ سنین مسلسل لکھے گئے ہیں۔

جناب غوری صاحب نے معارف دواوین میں تحریر فرمایا ہے" موخر الذکر (تتمہ صوان الحکمۃ) تو نزہۃ الارواح کا ماخذ ہے۔" (ص ۲۰۹) فاضل مقالہ نگار کا صرف اتنا لکھ کر سرسری طور پر گذر جانا تعجب خیز ہے، جب کہ میں نے خود اپنے مضمون میں تتمہ صوان الحکمۃ اور نزہۃ الارواح کی عبارتیں نقل کرکے دکھایا ہے کہ شہرزوری نے تتمہ سے عبارتوں کی عبارتیں نقل کر ڈالی ہیں، اور اپنے ماخذ کا ذکر تک نہیں کیا، اس لیے کہ اگر وہ ماخذ اور اس کے مصنف کا ذکر کرتا تو اس کا سرقہ ظاہر ہو جاتا، اور اس کا خطرہ اس لیے بھی زیادہ تھا کہ بیہقی کی تصنیفات وتالیفات ہر فن میں موجود تھیں، یہ سرقہ وہاں بالکل ظاہر ہو جاتا ہے جہاں بیہقی نے لکھا ہے کہ میں نے فلاں بات اپنی فلاں کتاب میں لکھی ہے، یا فلاں شخص سے اس کی گفتگو ہوئی ہے، ایسے مقام پر شہرزوری کا اتنی عبارت

حذف کر دیتا ہے، اور بعد کی عبارت سے سلسلۂ نقل جاری رکھتا ہے۔

ہم ذیل میں صرف دو مثالیں اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں:۔

تتمہ صوان الحکمۃ	نزہۃ الارواح
الدستور الفیلسوف حجۃ الحق	عمر الخیام النیسابوری الآباء و
عمر بن ابراهیم الخیام کان نیسابوری	الاجداد وکان تلمیذ ابی علی فی
المیلاد والآباء والاجداد	اجزاء علوم الحکمۃ الا انہ کان
وکان تلمیذ ابی علی فی اجزاء	سئی الخلق ...... ودخل
علوم الحکمۃ الا انہ کان سئی	حجۃ الاسلام الغزالی علیہ یوما
الخلق ...... دخل علیہ یوما	وسألہ عن تعیین جزء من اجزاء
الامام حجۃ الاسلام محمد الغزالی	القطبیہ مع کونہ متشابہ الاجزاء.
وسألہ عن تعیین اجزاء الفلک	...... فاطال الامام
القطبیۃ وانا قد ذکرت ذالک	عن الکلام وابتدأ.
فی کتاب عرائس النفائس من	
تصنیفی، فاطال الامام عمر	
الکلام وابتدأ	
الملک العادل عضد الدنیا	عضد الدین ...... ملک یزد
والدین علاء الدولۃ فرامرز	کان عادلا عالما ولہ کتاب
ابن علی بن فرامرز ملک یزد، کان	سماہ بہجۃ التوحید وکان
ملکا عادلا عالما رایتہ بخراسان	یذہب عن رای ابی البرکات.

سنة عشرة وخمسمائة، وكان
عرض على والدى تصنيفه الذى
سماه بهجة التوحيد وكان
يلذب عن هواى ابى البركات بن
ملكا الطبيب البغدادى.

ان مثالوں سے اس بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شہزوری علمی سرقہ کا مرتکب ہے، ایسی حالت میں کیا غوری صاحب کے ارشاد کے مطابق "احترام متقدمین" کی خاطر اس تحقیق کو پردۂ خفا میں رکھنا چاہئے تھا۔

جناب ناقد نے جو یہ خیال ظاہر فرمایا ہے "کہ بیہقی ۵۴۹ھ کے سولہ سال بعد ۵۶۵ھ تک زندہ رہا، اس لیے ناممکن ہے کہ وہ صرف دو ہی کتابیں لکھے۔"(۲۹) ہمارے خیال میں اس میں کئی امکانات کی گنجایش ہے، ممکن ہے کہ ماں اور بیٹے کے موت کے غم نے اس کو مدت تک قلم اٹھانے سے باز رکھا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بیہقی چونکہ بڑا عالم تھا، اس لیے غم غلط کرنے کے لیے پھر سے تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا ہو، اس کی کبر سنی بھی نظر انداز نہیں کیجا سکتی، جو زیادہ تصانیف میں مانع ہو سکتی ہے، یہ بھی خارج از قیاس نہیں کہ اس نے دو سے زیادہ کتابیں تالیف کی ہوں گی جو اب ناپید ہیں، اور اس کی دوسری تصانیف کی طرح ان کا کسی مورخ و مصنف نے ذکر نہیں کیا، چونکہ تاریخ بیہقی اور لباب الانساب کا ذکر آیا ہے، اس لیے ہم فی الحال انھیں دو کتابوں کو مانتے ہیں، جب تک اس کی اور کسی تصنیف کا پتہ نہ چل جائے اس وقت تک محض قیاس سے تو فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک جگہ غوری صاحب نے میری ایک عبارت کا حوالہ درج کر کے حسب عادت اس کو توڑ مروڑ کر

میرے منشا کے خلاف نتیجہ نکالا ہے، میں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ تتمہ صوان الحکمۃ کی ترتیب شروع یا وسط سے تاریخ وار ہے، بلکہ آخر کتاب کو سن وار لکھا ہے، اور غوری صاحب نے ابتدائے کتاب اور وسط کتاب کے الفاظ میرے سر تھوپ دیا، معارف جلد ۹۰ نمبر ۵ ص ۳۶۶ پر میری یہ عبارت درج ہے:

"تتمہ کے غائر مطالعہ کے بعد اس میں جو سنین قریب اختتام کتاب واقع ہوئے ہیں وہ ۵۴۴ھ سے ۵۴۹ھ تک مسلسل ہیں۔"

اس کے بعد جناب غوری صاحب لکھتے ہیں: "بالفاظ دیگر جناب ڈاکٹر صاحب نے ترتیب و تحریر کتاب (تتمہ صوان الحکمہ) میں دو اصولوں کو بطور مسلمہ کے تسلیم کر لیا ہے:

ا۔ کتاب کی ترتیب تاریخی ہے۔

ب۔ مصنف نے ہر سنہ کے واقعات یا شخصیات کے ذکر کا التزام کیا ہے، حالانکہ دونوں باتیں نہیں ہیں، نہ ابتدائے کتاب میں نہ وسط میں نہ قریب اختتام کتاب۔"

اس تحریر کے بعد شروع سے حکما کے نام گنانا شروع کر دیے ہیں، حالانکہ میری جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے اس میں صرف آخر کتاب کا ذکر ہے، باقی سب غوری صاحب کا اضافہ ہے۔

پیرس میں علامہ قزوینی سے ملاقات کے وقت تک موصوف تتمہ صوان الحکمۃ سے لاعلم تھے جس کا وہ خود اپنے مضمون میں ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:۔

"تاریخ تالیف تتمہ صوان الحکمہ بطور تحقیق برائے راقم سطور معلوم نیست چہ ہنوز اصل نسخہ بنظرمن نرسیدہ است۔"

اس سے ظاہر ہو گا کہ ابتداء میں میں نے جو جملے موصوف کی طرف منسوب کیے ہیں وہ صداقت پر مبنی ہیں، اس سے خواستائی مقصود نہیں، بلکہ صرف ایک واقعہ کا اظہار مقصود ہے، اور تتمہ میں مذکور عمر خیام کے ترجمے سے لاعلمی کی بنا پر ہی انھوں نے مجھ سے اس کی نقل کی خواہش کی تھی، چنانچہ میں نے اصل مخطوطہ میں جس طرح لکھا تھا

نقل کرکے بھیجدیا، اب اگر اصل ہی میں کوئی غلطی تھی تو اس کی اصلاح میں خود کیسے کرسکتا تھا، چنانچہ آقائے قزوینی خود لکھتے ہیں:

"در سوادے کہ آقائے کلیم اللہ ہندی ازیں ترجمہ حال برائے من فرستادہ اند بعضے اغلاط جزئیہ مشاہدہ می شود کہ اغلب آنہا ظاہراً در نسخہ اصل بودہ است ولے بعضے از انہا شاید مربوط ناسخ یعنی آقائے کلیم اللہ باشد سہواً و غفلۃ"

آقائے قزوینی کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد جناب غوری صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ رائے ہے فارسی زبان وادب کے مبصر کی جناب ڈاکٹر صاحب کی اس "کاوش تحقیق" کے متعلق جس کی اساس پر انھوں نے متقدمین کی تحقیقات پر خط نسخ پھیرنے کی کوشش کی ہے آقائے قزوینی کی اس رائے کی صحت کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں"

آقائے قزوینی کی اس عبارت میں دو چیزوں کا ذکر ہے، ایک تو ان کو ترجمہ حال خیام کی نقل بھیجنے کا، دوسرے اغلاط جزئیہ کا جو اصل نسخہ میں تھیں یا میری سہو یا غفلت سے جو مجھ سے نقل میں ہوگئی تھیں، اس کا میرے بارہ میں ایک مبصر کی رائے سے کیا تعلق،

جناب شبیر احمد خانصاحب غوری کو کسی عبارت کو توڑ مروڑ کر اپنا مطلب برآمد کرنے اور اعتراض کرنے میں کمال حاصل ہے، اگر کوئی علمی نظریہ کسی مستند کتاب سے ثابت ہوتا ہے تو اس سے کوئی معقول پسند آدمی کب انکار کرسکتا ہے، لیکن کسی معمولی چیز کا سہارا لیکر دوسروں پر طعن و تشنیع کرنا کہاں تک اہل علم کے شایان شان ہے، تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا اور کسی کی تحقیق حرف آخر نہیں کہی جاسکتی، خیام کے متعلق بھی جو جدید ماخذ و معلومات حاصل ہوتے رہتے ہیں اور آئندہ بھی ہوسکتے ہیں، اس سے کس کو انکار ہے،

لیکن تتمہ صوان الحکمۃ کے متعلق ہماری اب بھی وہی رائے ہے کہ وہ ۵۴۹ھ تک لکھی جاچکی

تھی، اسی لیے وہ اس سنہ تک کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست میں شامل کی گئی، ورنہ ۵۶۰-۶۳ھ کی تحریر کردہ کتاب کا (جیسا کہ جناب غوری صاحب کا خیال ہے) ذکر ۵۴۹ھ میں ۱۱، ۱۳ سال قبل آنا کس طرح قرین قیاس ہوسکتا ہے؟ چنانچہ تاریخ بیہق ۵۶۳ھ کی تصنیف کا اور لباب الانساب کا جو ۵۴۹ھ کے بعد لکھی گئیں، کوئی حوالہ اس فہرست کتب میں موجود نہیں ہے،

البتہ سنہ ۵۵۳ھ اور ۵۶۰ھ سے اگر وہ صحیح ہیں، یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ بیہقی نے بعد میں مکرر تتمہ صوان الحکمۃ کی نظر ثانی کرکے اس میں کچھ اضافہ کیا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تبع تابعین جلد اول

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابۂ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابۂ کرام کے بعد انہی کی زندگی ملت اسلامیہ کے لیے نمونۂ عمل ہے، بالکل اسی طرح تابعین کرام کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین "تابعین" کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کرچکا ہے، اب اس نے ان کے بعد کے مقدس آب بزرگوں کا مرقع تیار کیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور ان کے فقہی مسلک کے علمبردار امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور مجتہدات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کا دوسرا حصہ جس میں ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کے حالات ہیں،

(مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی)

قیمت :- آٹھ روپے (۸؍)

منیجر

بہار کے صوفیائے کرام

از جناب سید شمیم احمد صاحب ڈھاکہ

(۲)

قادریہ بہار میں ساتویں و آٹھویں بلکہ نویں صدی کے نصف اول تک قادریہ سلسلہ کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی، گو اس سلسلہ کے متعدد بزرگ بنگال اور بہار میں موجود تھے، مگر ان کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع نہ تھا، مخدوم الملک کے معاصرین میں اس سلسلہ کے سب سے مشہور و معروف بزرگ پیر شاہ عطاء اللہ بغدادی ہیں، جن کا روضہ بہار شریف میں محل پر اور شیر پور کے درمیان سڑک سے تھوڑی دور پر ندی کے کنارے ہے، یہ جگہ عرف عام میں پیر ستہ گھاٹ کہلاتی ہے، جو پیر شاہ عطاء اللہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، قادریہ سلسلہ کی دوسری مشہور ہستی حضرت داؤد قریشی[1] کی ہے، جو حضرت صدر الدین راجو قتال بخاری کے مرید اور خلیفہ تھے، دسویں صدی ہجری میں حضرت قمیص[2] قادری کی ذات سے بہار و بنگال میں اور ایک حد تک پنجاب میں قادریہ سلسلہ کو مقبولیت حاصل ہوئی، مغربی بنگال میں بمقام ساڈھورہ حضرت قمیص قادری مدفون ہیں، آپ کا چلہ بہار شریف اور لدھیانہ میں بھی ہے، تینوں مقامات پر عرس ہوتا ہے، بہار شریف کے نزدیک ایک گاؤں قمیص پور آپ ہی کے نام پر ہے، حضرت قمیص قادری کا ذکر اخبار الاخیار میں بھی ہے، پیر شاہ عطاء اللہ اور حضرت قمیص قادری حضرت غوث پاک کی اولاد میں بتائے جاتے ہیں، قادریہ سلسلہ کو زیادہ عروج مغلوں کے

---

[1] ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ، مخزن الانساب از سید کریم الدین [2] اخبار الاخیار ص ۴۵۶، سوفزم، بشپ جان سبحان ص ۲۶۶

دور میں ہوا، اور آج یہ حال ہے کہ شاید ہی کوئی ایسی خانقاہ یا گدی ہو جہاں اس سلسلہ میں بیعت نہ لی جاتی ہو۔

بہار کے اولیائے کرام کی فہرست بہت طویل ہے، اس مضمون میں سب کا ذکر ممکن نہیں، صرف بعض بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس صوبہ کے اولیائے کبار میں ہیں، مذکورہ بالا خانوادوں کے علاوہ قلندریہ، شطاریہ اور مداریہ سلسلوں کا بھی کچھ نہ کچھ اثر بہار میں رہا، مخدوم الملک کے زمانہ میں حضرت جلال گنج رواں نام کے ایک قلندری مشرب بزرگ بہار تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے، چھوٹی درگاہ اور محل پر کے درمیان ویرانہ میں ان کا مزار ہے، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی نے مکن پور جا کر حضرت بدیع الدین مدار سے تصوف کے بعض مسائل حل کیے تھے، یہ بھی روایت ہے کہ آپ مخدوم الملک کی ہدایت کے مطابق حضرت بدیع الدین مدار کے ہاں گئے تھے، بہار میں چند خواتین بھی صاحب کمال گذری ہیں، جن میں سے دو کو شہرت عام حاصل ہوئی، ایک حضرت بی بی کمال کو کی جو قاضی شہاب الدین پیر جگجوت کی صاحبزادی اور مخدوم الملک کی خالہ تھیں، دوسری پیر بدر عالم زاہدی کی صاحبزادی حضرت بی بی ابدال جن کا روضہ دیوی سرائے (بہار شریف) میں ہے۔

ایک تاریخی عرضداشت جس زمانہ میں شہزادہ عظیم الشان بہار کے گورنر کی حیثیت سے پٹنہ میں مقیم تھا، مولانا نصیر الدین نام کے ایک بزرگ نے صوبہ کے صوفیائے کرام کے مزارات اور آستانوں کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلا کر شہزادہ اودھ سے ان کی تعمیر و مرمت کے لیے مالی امداد کی درخواست کی تھی، یہ تاریخی عرضداشت روزنامہ صدائے عام پٹنہ کے عید نمبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکی ہے، ڈاکٹر اختر اورینوی نے بھی اپنی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں اسے نقل کیا ہے، اس عرضداشت میں جن آستانوں کی فہرست پیش کی گئی ہے، وہ درج ذیل ہے۔

(۱) مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد، بہار شریف متوفی ۷۸۲ھ (۲) شیخ شعیب بن شیخ جلال موضع شیخپورہ پرگنہ مالدہ (۳) سید محمد عظیم آباد (پٹنہ) (۴) شیخ خلیل الدین عرف شیخ منگن، د

شیخ تاج الدین، عظیم آباد، پٹنہ (۵) سید سلیم عالم گنج عظیم آباد پٹنہ (۶) درویش ارزانی محلہ درگاہ
عظیم آباد پٹنہ (۷) شیخ محمد محمود و شیخ عین الدین حسینی لودی کٹرہ عظیم آباد پٹنہ (۸) شیخ شہاب الدین
موضع جیر ٹھلی عملہ پرگنہ حویلی بلدہ عظیم آباد (۹) شیخ آدم صوفی موضع جیو ٹھلی عملہ پرگنہ حویلی بلدہ عظیم آباد
(۱۰) سید محمد قصبہ بہار (۱۱) شیخ احمد چرم پوش متوفی ۷۷۶ھ (۱۲) شیخ بدر عالم یہ بزرگ قصبہ بہار
میں مدفون ہیں، شیخ موصوف کے فرزندوں میں شیخ بدہی نے شیر شاہ کے زمانہ میں بھوجپور کے قریب ہمایوں سے ملاقات کی تھی،
اس اثنا میں خبر ملی کہ شیر شاہ آرہا ہے، شیخ بدہی نے سات سو سواروں کیساتھ خود شیر شاہ سے جنگ کی اور تمام سواروں
کے ساتھ شہید ہوئے، شیر شاہ نے انکی تمام جاگیریں ضبط کرلیں، جنھیں بعد میں مغل بادشاہوں نے واپس
کردیا (۱۳) حضرت حسین نوشہ توحید حضرت مظفر بلخی کے بھتیجے قصبہ بہار (۱۴) شیخ حمید الدین
ولد شیخ آدم صوفی قصبہ بہار (۱۵) سید یٰسین دانشمند قصبہ بہار (۱۶) مولانا حسام الدین قصبہ بہار
(۱۷) سید فضل اللہ قصبہ بہار (۱۸) شیخ فرید طویلہ بخش قصبہ بہار (۱۹) شیخ یتیم اللہ سفید باز بن
شیخ حمید الدین قصبہ بہار (۲۰) شیخ سعادت قصبہ بہار (۲۱) سید عطاء اللہ قصبہ بہار،
(۲۲) سید محمد ابراہیم بن ابوبکر عرف ملک بیا متوفی ۷۵۳ھ (۲۳) خواجہ اسحٰق مغربی متوکھر
(۲۴) شیخ یحییٰ منیری (۲۵) شیخ جلال، منیر (۲۶) حاجی صفی الدین و حاجی نظام الدین قصبہ منیر
پرگنہ شاہ پور (۲۷) شیخ احمد موضع بیا پور پرگنہ شاہ پور (۲۸) شیخ دولت قصبہ منیر (۲۹) مولانا
نور، خواجہ قطب الدین دہلوی کے سگے بھائی موضع گگھول پرگنہ سلیم آباد (۳۰) شیخ فتو و شیخ برہان
پرگنہ سلیم آباد (۳۱) سید فخر الدین موضع اوکھدی (۳۲) سید صفی موضع صفی پور پرگنہ بیم پور سرکار
(۳۳) شیخ داؤد شطاری قصبہ محب علی پور پرگنہ معد قہ سرکار (۳۴) سید محمد عرف جمن حق
متوفی ۹۲۵ھ موضع بلسہ پرگنہ بلخ سرکار (۳۵) سید راستی خلیفہ شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ
منیری پھلواری عملہ پرگنہ حویلی سرکار عظیم آباد (۳۶) شیخ ضیاء الدین سہروردی متوفی ۸۲۶ھ

موضع چنڈوس (پٹنہ) (۳۷) شیخ شمس چنائی موضع لموری (۳۸) شیخ کمال الدین موضع بیاپانی
(بہار) (۳۹) سید محمد پرگنہ بلیر سرکار، سارن (۴۰) سید احمد غازی موضع امرتھ پرگنہ بست ہزاری سرکار
(۴۱) سید نوح متوفی ۸۷۶ھ موضع نوح پور (۴۲) شیخ سعد قصبہ ابراہیم پور (۴۳) حوض
رانی عملہ پرگنہ حویلی بہار سرکار میں بہت سے اولیائے کرام مدفون ہیں، مثلاً سید علاء الدین سمدانی،
سید رکن الدین، سید بجود، سید مومن، سید لاہا، قاضی شمس الدین، حافظ یوسف، سید
قطب الدین، سید محمد سعید، سید جہانگیر، سید محمد، شیخ مدو، شیخ بدہی، بی بی کمہ (۴۴) شیخ
ادریس موضع نافع ضلع مونگیر سرکار (۴۵) سید چہاری بنیاسی قصبہ مونگیر (۴۶) شیخ مصطفےٰ
باسدیو پور (۴۷) سید ابراہیم قصبہ سورج گڈھا (۴۸) مولانا شہباز بھاگل پوری (۴۹) سید
اولیا پرگنہ بلیا سرکار (۵۰) شیخ عبد الحئی حاجی پور (۵۱) شیخ محمد معروف بہ شیخ قاضی موضع
بنیا لبسار حاجی پور (۵۲) شیخ ابو الفتح بن شیخ محمد متوفی ۹۴۰ھ موضع تنکول حاجی پور،
(۵۳) مولانا خواجہ علی حاجی پور (۵۴) شیخ برکت اللہ عرف شیخ قتال، خلیفہ حضرت خواجہ
محمد گیسو دراز قصبہ دربھنگہ (۵۵) شیخ سلطان حسین دربھنگہ (۵۶) شیخ شمس الدین عرف ثمن
دربھنگہ (۵۷) شیخ ظہور و حاجی حمید رتن سرائے سارن (۵۸) شیخ دلاور شیر چابک مار
سارن (۵۹) میر عبد الملک بارہ سرکار سارن (۶۰) شیخ محمد یوسف قلعہ رہتاس کلاں (۶۱)
چندن شہید معروف بہ چندن شہید سیرام (۶۲) شیخ عثمان حسین پور (۶۳) شیخ عبد العلیم
مسی چارن (۶۴) سید عمر شہید آرہ

چار بڈّے نویں اور دسویں صدی ہجری میں بڈّے، بڈھ، اڈّے، برن یا بدی کے نام سے بہار میں
چار مشائخ مشہور ہوئے، ان چاروں کے نام شیخ بڈّے حقانی، شیخ بڈّے طبیب زنجانی،
شیخ بڈّے زاہدی اور شیخ بڈّے منیری ہیں، ان میں بڈّے زاہدی اور بڈّے منیری کا شیر شاہ سوری

کے زمانے میں قتل ہونا مشہور ہے، بڈھے زاہدی اور شیر شاہ سوری کی جنگ کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، بڈھے یا بڈھن منیری کا حال وسیلۂ شرف میں اس طرح ہے:-

"حضرت ملک العلما، مخدوم شیخ بڈھن[1] قدس اللہ سرہ العزیز کو بیعت و خلافت و تربیت حضرت شیخ درویش سے ہے، آپ حضرت مخدوم شاہ دولت منیری کے ماموں ہوتے تھے، اس وقت منیر میں سکہ فردوسیہ آپ کے نام سے جاری تھا، میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ فرید خاں نے جو پرگنہ سہسرام وغیرہ کا جاگیردار تھا، ایک بار ایک شیر کو مارا تھا، اس دن سے شیر خاں اس کا لقب پایا اور جب بادشاہ ہوا شیر شاہ مشہور ہوا، وہ حضرت مخدوم شاہ بڈھن کا مرید تھا، ایک بار آپ نے خوش ہو کر فرمایا کہ شیر خاں دہلی کا قصد کر، تخت خالی ہے، جا تجھ کو بادشاہی ہوگی، وہ خوش ہو کر چلا، پیر کے کہنے پر وثوق تھا، جی میں کہا کہ بادشاہی تو ضرور ہوگی، ذرا سیر کرتا چلوں، چین سے سیر کرتا ہوا چھ مہینے کے بعد دہلی میں پہنچا، جب تک ہمایوں شاہ کہ ملک گیری کو گئے ہوئے تھے، دہلی میں پھر آئے، شیر خاں کی گوں کچھ نہ لگی، شکست کھائی، بگڑ کر غصہ میں آیا کہ میرا پیر اور جھوٹا، پلٹ کر منیر میں آیا، اور اپنے پیر کو اور ان کے فرزندوں کو قتل کیا۔"

تاریخی حیثیت سے شیخ بڈھے زاہدی کا واقعہ زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے، عجب نہیں کہ دونوں ایک ہی بزرگ ہوں، منیر میں کسی وجہ سے رہ گئے ہونگے، اس لئے منیری کہلانے لگے، وسیلۂ شرف میں درج ہے کہ آپ شاہ دولت منیری کے ماموں ہوتے تھے، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ منیر میں آپ کی بہن کی شادی ہوئی تھی، حضرت بڈھن منیری کو بیعت و خلافت و تربیت شیخ درویش بلخی سے حاصل تھی، اور وہ بہار شریف میں مخدوم الملک کے آستانہ کے

[1] وسیلۂ شرف ص ۹۹

سجادہ نشین تھے، اس سے بھی یہی گمان ہوتا ہے کہ شیخ بڈھے دراصل بہار شریف کے رہنے والے تھے، اور یہ وہی بڈھے زاہدی ہیں۔

حضرت بڈھے اپنے دور کے علما میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، شیر شاہ سوری اور اس کا لڑکا اسلام خاں سوری آپ سے گہری عقیدت رکھتے تھے، شیخ علائی[1] اور مخدوم الملک عبد اللہ سلطانپوری کے سلسلہ میں حضرت بڈھے طبیب کا ذکر منتخب التواریخ اور تاریخ فرشتہ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے، مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی "تذکرہ" میں حضرت بڈھے طبیب کا ذکر کیا ہے، سکندر لودی[2] جب بہار آیا تھا تو اس نے شیخ فخر الدین زاہدی کے علاوہ جن بزرگوں کو عطیات و نذرانے پیش کیے تھے، ان میں بڈھے حقانی، بڈھے طبیب اور بڈھے منیری بھی تھے۔

صوفیائے کرام کا تبحر علمی پرانے صوفیہ و مشائخ محض گدی نشین اور رسمی سجادہ نشین نہیں ہوتے تھے، بلکہ دینی تعلیم سے بھی پوری طرح آراستہ ہوتے تھے، اور بعض کا شمار تو علمائے وقت میں ہوتا تھا، جو تصنیف و تالیف سے بھی دین و ملت کی خدمت کرتے رہتے تھے، مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری کا تبحر علمی محتاجِ تعارف نہیں، آپ کی تصانیف و تالیفات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے، یہ سب تصانیف فارسی زبان میں ہیں، آپ کے مکتوبات بھی علمائے دین و اربابِ طریقت دونوں کی نگاہوں میں بڑی قدر سے دیکھے جاتے ہیں، مخدوم الملک نے اپنی تصانیف کے ذریعہ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے ارباب طریقت کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے، آپ کی تصانیف میں شرح آداب المریدین اور مکتوبات صدی کو قبول عام کی سند مل چکی ہے، علامہ ابو الفضل[3] نے اپنے دفتر میں تین ابواب شرح آداب المریدین کے لیے وقف کیے ہیں،

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول مقالہ دوم (در ذکر سلطان سلیم شاہ افغان)، تذکرہ مولانا ابو الکلام آزاد بحوالہ منتخب التواریخ، ملا عبد القادر بدایونی [2] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۵۰۷ [3] دفتر ابو الفضل، مطبوعہ نولکشور پریس (جلد اور صفحات یاد نہیں رہے)

مخدوم سید جلال[1] بخاری جہانیاں جہاں گشت آپ کے مکتوبات کا بڑے انہماک سے مطالعہ کرتے تھے،

مخدوم الملک کے چچا زاد بھائی مخدوم شاہ شعیب شیخپوری کی تصنیف مناقب الاصفیا ہندوستان میں صوفیہ کے تذکرہ میں پہلی کتاب ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر مولانا مظفر بلخی تک فردوسیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کا ذکر ہے، مخدوم الملک اور مخدوم شاہ شعیب کی تصانیف میں زبان و ادب کی خوبیاں بھی ہیں، ان کا انداز بیان بڑا موثر اور دلکش ہے، مخدوم احمد چرم پوش اور حضرت حسین نوشہ توحید بلخی فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے، فردوسیہ سلسلہ کے دوسرے مشائخ کی کئی تصانیف بھی پائی جاتی ہیں، پیر بدر عالم زاہدی، مخدوم فرید طویلہ بخش، شاہ سلطان زاہدی، حضرت بڈھے حقانی، بڈھے طبیب زنجانی، مخدوم حسن بلخی، مخدوم احمد لنگر دریا، مخدوم شاہ عین الدین جگمی اور مخدوم شاہ علاء الدین زاہدی بھی علما میں تھے، ان میں کئی بزرگوں کی تصانیف اب تک موجود ہیں، حضرت بڈھے طبیب نے قاضی ارشاد[2] کی شرح لکھی تھی، اکثر صوفیاء و مشائخ کے علمی کارنامے ان کے خاندان میں غیر مطبوعہ پڑے ہوئے ہیں، جو رفتہ رفتہ ضائع ہو رہے ہیں۔

سلاطین و امراء سے تعلقات

سلاطین و امراء پر صوفیائے کرام کا ہر دور میں اثر رہا، ان کے دلوں میں صوفیہ و مشائخ کی بڑی عقیدت تھی، یہ بزرگ نہ سلاطین کے جبر و تشدد سے مرعوب ہوتے اور نہ مال و دولت کی طمع انھیں حق و صداقت کی راہ سے ہٹاتی، وہ وقتاً فوقتاً سلاطین و امراء کو عدل و انصاف کی تلقین کرتے اور ظلم و جور سے ڈراتے رہتے تھے، مخدوم الملک شرف الدین بہاری چوسا (بھاگلپور) کے حاکم قاضی شمس الدین[3] کو خطوط کے ذریعہ طریقت کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہ تمام خطوط مکتوبات صدی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، آپ کا ایک خط فیروز تغلق[4] کے نام بھی ہے،

[1] مناقب الاصفیاء ص ۱۴۰، وسیلۂ شرف ص ۱۲، تاریخ سلسلۂ فردوسیہ ص ۴۶ [2] تاریخ فرشتہ، منتخب التواریخ، تذکرہ ۱۷۶
[3] تاریخ سلسلۂ فردوسیہ ص ۱۹۷، مکتوب صدی (اردو ترجمہ) مطبوعہ ڈھاکہ [4] بزم صوفیہ ص ۳۷۳ تاریخ سلسلۂ فردوسیہ

بزم صوفیہ میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن نے یہ خط نقل کیا ہے، بنگال کے سلطان سکندر شاہ کے تعلقات شیخ علاء الحق پنڈوی سے کشیدہ تھے، اس لیے وہ مخدوم الملک ہی سے دینی امور میں صلاح و مشورہ لیا کرتا تھا، افسوس کہ سکندر شاہ کے نام مخدوم الملک نے جو خطوط لکھے تھے وہ نایاب ہیں، مگر اس کا ذکر مولانا مظفر بلخی کے ایک خط میں ہے، جو انھوں نے سکندر شاہ کے لڑکے سلطان غیاث الدین اعظم[1] شاہ کو لکھا تھا، مولانا مظفر بلخی نے اعظم شاہ (۷۹۵ھ - ۸۱۳ھ) کو عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے مرشد شیخ شرف الدین بہاری بھی تمھارے والد کو احکام شریعت کے مطابق حکمرانی کرنے کی تلقین کرتے تھے، ایک دوسرے خط میں مولانا مظفر بلخی نے سلطان سے درخواست کی ہے کہ وہ درویشوں کی ایک جماعت کے ساتھ حج کو جانا چاہتے ہیں، اس لیے چاٹگام کی بندرگاہ سے جہاز کا انتظام کر دیا جائے،

شیخ الاصفیا پیر بدر عالم زاہدی سے بنگال کے پہلے آزاد و خود مختار سلطان فخر الدین مبارک شاہ (۷۳۹ھ - ۷۵۰ھ) اور اس کے امرا کو گہری عقیدت تھی، سلطان آپ سے بیعت بھی تھا، ڈاکٹر انعام الحق پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی نے "مسلم بنگالہ ساہتیہ" اور "پوربا پاکستانے اسلام" میں پیر بدر عالم زاہدی کے اثر و رسوخ پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے، ابن بطوطہ کے سفر بنگال کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ "مسلم بنگالہ ساہتیہ" میں لکھتے ہیں کہ "ابن بطوطہ[2] کو یہ بھی معلوم ہوا کہ درویش بدر الدین علامہ عرف بدر پیر نے سلطان فخر الدین کے ایک جنرل بادل خاں کو چاٹگام فتح کرنے کو بھیجا"، پیر بدر عالم کے پرپوتے شیخ فخر الدین زاہدی کا بنگال کے حکمرانوں پر جو اثر تھا، اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان محمود ثالث (۸۴۶ھ - ۹۳۹ھ)

[1] سوشیل ہسٹری آف دی مسلمز ان بنگال ص ۵۵ تاریخ سلسلۂ فردوسیہ ص ۲۷۲، جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی ۱۹۵۶ء ص ۱۶
[2] مسلم بنگلہ ساہتیہ ص ۳۳، پوربا پاکستانے اسلام ص ۲۳

نے خود کو "عبد اللہ‌ؒ" کے نام سے مشہور کیا تھا، جناب خلیق احمد نظامی نے "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" میں سلطان سکندر لودی کے سفر بہار کا جو حال لکھا ہے، اس سے صوفیا کے کردار پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، "بہار کے قیام کے زمانہ میں سکندر لودیؒ بہت سے علما، اور مشائخ سے ان کے مکانوں پر جاکر ملتا تھا، بہار کے ایک مشہور بزرگ شیخ فخر الدین زاہدی تھے، بنگال کے بادشاہ ان کے مرید تھے، بہار میں ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا، جو بھی ان سے ملنے کے لیے جاتا تھا، اس کو شربت پلاتے تھے، جس وقت سکندر ان سے ملنے کے لیے گیا تو اتفاق سے "مصری اور چینی" موجود نہ تھی، ایک خادم نے اشارہ سے بتایا۔ اپنی انگلی سے اشارہ کیا کہ "از شیرینی چینی خراشیدہ شربت ساختہ بیارید" یعنی مٹھائی پر سے شکر کھرچ کر شربت بنا کر لے آؤ" اور سلطان اور اس کے ساتھیوں نے یہ شربت پیا۔

سکندر جب تک بہار میں رہا پابندی کے ساتھ نماز جمعہ کے لیے حاضر ہوتا تھا، ایک مرتبہ اس کو آنے میں دیر ہو گئی، میاں بدی حقانی نے اس کا انتظار کیے بغیر جماعت کھڑی کر دی، سلطان اس وقت پہنچا جب نماز ختم ہو چکی تھی، مولانا جمالی نے سمجھ لیا کہ نماز ہو چکی ہے، لیکن درباری ذہنیت سے مجبور ہو کر نمازیوں سے کہنے لگے "اے مرداں! ایں ایں مقدار تاخیر نباید کرد کہ بادشاہ بیاید" یہ سنکر شیخ بدی حقانی نے فرمایا "من نماز خدا را گزاردیم دگذاردیم" سکندر نے مولانا جمالی کو خاموش کر دیا، اور میاں بدی سے عرض کی کہ آپ نے اچھا کیا کہ نماز پڑھ لی، کوتاہی تو میری ہی ہے"، بہار کے قیام کے زمانہ میں سلطان شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مزار پر بھی حاضر ہوا تھا، اور وہاں کے فقرا و مساکین میں خیرات تقسیم کی تھی، سکندر لودی نے بہار سے روانگی کے وقت وہاں کے علما، و مشائخ بالخصوص

لے ہسٹری آف بنگال ج ۲ ص ۱۵۵ تے سلطان دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۵۶ بحوالہ (گلزار ابرار اور افسانۂ شاہاں)

بدی حقانی، شیخ بہرن منیری، شیخ بدھ طبیب، شیخ فخر الدین وغیرہ کو نذریں پیش کیں،

تاریخ فرشتہ میں شہنشاہ بابرؒ کا مخدوم الملک کے والد مخدوم یحییٰ منیری کے آستانہ (منیر) پر حاضر ہونا مذکور ہے، شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں حضرت بڑے زاہدی کا ڈٹ جانا حق و صداقت کی ایک شاندار مثال ہے، شیر شاہ اور ہمایوں کی جنگوں کے سلسلے میں ایک بزرگ شیخ خلیلؒ کا نام بھی آتا ہے، جو در بھنگہ کے علاقہ میں رہتے تھے، انھوں نے دونوں کے درمیان صلح و مفاہمت کرانے کی کوشش کی تھی، ہمایوں اور شیر شاہ دونوں شیخ کا احترام کرتے تھے، تذکرۃ الواقعات میں جس کا مصنف جوہر آفتابچی ہے، اور جو ہمایوں کے عہد کی تاریخ ہے، شیخ خلیل کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہے، حکومت کی طرف سے بزرگان دین کی مدد معاش اور ان کی خانقاہوں کے مصارف کے لیے جائدادیں اور نقد رقم بھی دیجاتی تھی، چنانچہ آج بھی بہار کے مختلف خانقاہوں میں اس قسم کی املاک و جائدادیں اور اس کے فرامین و دستاویزات موجود ہیں۔

لے تاریخ فرشتہ مطبع نولکشور، ذکر سلطنت شہنشاہ بابر تے تذکرۃ الواقعات از جوہر آفتابچی ص ۳۳، ۳۴، ۳۵ (اردو ترجمہ) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی

بزم صوفیہ

یعنی عہد تیموری سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ نظام الدین اولیا، بو علی قلندرؒ پانی پتی، شیخ فرید الدینؒ عراقی، خواجہ گیسو درازؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات۔

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

ضخامت ۵۳۸ صفحے ۔ قیمت [illegible]

منیجر

تلخیص و تبصرہ

استنبول کی جدید اسلامی یونیورسٹی

ترکی میں جمہوری حکومت کے قیام کے بعد سب سے پہلے نومبر ۱۹۵۹ء میں اس مقصد کے لیے استنبول میں ایک جدید اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی کہ اس کے ذریعہ ترکی کی موجودہ نسل کو اسلامی ثقافت کا حامل اور اسلامی علوم و فنون کی قدروں کا محافظ بنایا جا سکے،

درسگاہ کے مقاصد اس درسگاہ کا مقصد (۱) ترکی نسل میں اسلام سے شیفتگی، اس کی تہذیب و ثقافت، قرآنی تعلیمات کو اپنی زندگی میں جاری کرنے، دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے، مشرق وسطیٰ میں اسلامی قدروں اور مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کے احیاء میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنا،

(۲) ایسے صاحب افتاء، واعظ، ائمہ و خطباء، اور ثانوی درسگاہ اور دوسری درسگاہوں کے لیے اسلامی علوم و فنون کیلئے مدرسین تیار کرنا جو موجودہ زمانہ کے حالات سے باخبر ہوں،

یونیورسٹی میں داخلہ کے شرائط یونیورسٹی میں داخلہ کے وہی طلبہ مستحق ہوں گے جنھوں نے ثانوی درسگاہ کے مدارس ائمہ و خطباء، سے قرآن، تفسیر اور عربی ادب و انشاء کے امتحان میں کامیابی کی سند حاصل کی ہو،

مدارس، ائمہ و خطباء ۱۹۵۱ء میں ترکی کے بڑے بڑے شہروں، استنبول، انقرہ، قونیہ اور قیصری میں ائمہ و خطباء، کے مدارس کی بنیاد رکھی گئی، یہ مدارس اپنی افادیت کی وجہ سے برابر ترقی کرتے رہے، ۱۹۶۳ء میں ان کی تعداد ۲۶ تک پہنچ گئی، یہ دینی مدارس وزارت تعلیم کے ماتحت ہیں، اور اس کے

معارف حکومت برداشت کرتی ہے، ان مدارس میں اماموں اور خطیبوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ مذکورہ بالا اعلیٰ درسگاہ کے لیے طلبا، تیار کیے جاتے ہیں، ان مدارس میں ترکی کے پرائمری اسکولوں کے فارغ طلباء کا داخلہ ہوتا ہے، ان مدارس کی تعلیم وسطی اور ثانوی دو حصوں میں منقسم ہے۔

(۱) وسطیٰ: کی تعلیم چار سال کی ہے اور (۲) ثانوی کی تین سال کی،

وسطیٰ اور ثانوی میں حسب ذیل علوم کو بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے:

(۱) عام علوم: تاریخ، جغرافیہ، ادب، ریاضی، سائنس، کیمیا، علم الحیات، فلسفہ، نفسیات، منطق، غیر ملکی زبانیں (انگریزی، فرانسیسی، جرمنی)

(۲) دینی علوم: قرآن، ادب عربی، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسلامی فلسفہ، دینی اجتماعیات، دینی نفسیات، مذاہب عالم، تاریخ اسلامی، سیرت نبوی، اخلاق، اسلامی صنعت و حرفت، عقیدۂ اسلامی (توحید) فارسی،

درسگاہ اعلیٰ کی تعلیم اور اس کا نصاب درسگاہ اعلیٰ کی تعلیم کی مدت چار سال ہے، اس کے نصاب درس میں حسب ذیل مضامین ہیں:-

قرآن کریم، بلاغت قرآنی، تفسیر، حدیث، اسلامی عقائد (توحید) ادب عربی، تاریخ ادب عربی، شرائع اسلامی (فقہ)، اصول فقہ، اسلامی تاریخ، سیرت نبوی، تاریخ فرق اسلامیہ، مذاہب عالم، اسلامی ثقافت، ترکی ثقافت، اسلامی ترکی ادب، اسلامی فلسفہ، جغرافیہ ممالک اسلامی، تاریخ انقلاب ترکی، اسلامی صنعت و حرفت، دینی نفسیات، فلسفہ اخلاق، تاریخ فلسفہ اسلامی، تبلیغ و ارشاد، زندہ زبانیں (انگریزی، فرانسیسی، جرمنی) اسلامی موسیقی، فارسی،

اس کے اساتذہ اس وقت اس درسگاہ میں سات اساتذہ ہیں، جن میں چار استنبول یونیورسٹی کے اور تین جامع ازہر کے ڈاکٹر ہیں، ان کے علاوہ دوسرے اساتذہ مختلف درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہیں،

ایک دوسری علمی درسگاہ | استنبول کی اسلامی درسگاہ کے نہج پر گذشتہ سال قونیہ میں بھی ایک جدید اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی ہے، جس میں اس وقت تقریباً تین سو طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں، توقع ہے کہ آیندہ اس تعداد میں مزید اضافہ ہوگا،

حکومت کی قدردانی | استنبول اور قونیہ دونوں درسگاہیں وزارت تعلیم سے متعلق ہیں ان میں رات اور دن دو وقت تعلیم ہوتی ہے، ان کے بعض طلبہ کو وزارت تعلیم اور شعبہ نگران امور دینیہ سے وظیفہ بھی ملتا ہے، ان وظائف کے علاوہ ان درسگاہوں اور ائمہ اور خطباء کے مدارس کو مستقل امداد بھی ملتی ہے،

طلبہ کی تعداد | استنبول کی درسگاہ کے طلبہ کی تعداد اس وقت تقریباً تین سو (۳۰۰) ہے،

یونیورسٹی کے فارغین | یہ پہلا سال ہے کہ اس درسگاہ سے طلبا کی ایک جماعت فارغ ہوئی ہے، ان میں بعض ائمہ اور خطباء کے مدارس میں عربی ادب اور اسلامی علوم کے استاد اور بعض مفتی اور واعظ کے عہدوں پر مقرر ہوئے ہیں، اس درسگاہ کی ترقی کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ آیندہ سالوں میں اس کے فارغین کی تعداد میں اور اضافہ ہوگا،

"ا - ب"

دولتِ عثمانیہ جلد اول

سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ، اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

از عثمان اول ۱۲۸۸ء تا مصطفےٰ رابع ۱۸۰۸ء

ضخامت ۵۰۸ صفحے قیمت :- [illegible]

منیجر

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب سید حسین بلگرامی

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی

ادھر کئی مہینوں سے مشاہیر کے مکاتیب کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوگیا تھا، اب اس کو پھر شروع کیا جاتا ہے۔

۲۵ صفر ۱۳۳۳ھ
۱۲ جنوری ۱۹۱۵ء

مکرمی!

آپ کا خط مورخہ ۵ جنوری پہنچا، خود مولانا شبلی مرحوم ندوہ کے بہت شاکی تھے، اور جہانتک مسموع ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ ندوہ اب بالکل قدیم وضع اور پرانے خیال کے مولویوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے، جن کا شغل سوا تکفیر مسلمین کے اور کچھ نہیں، ان کے زیر اثر اور ان کے سرپرستی میں کسی علمی اور قومی کام کے سرسبز ہونے کی امید نہیں کیجا سکتی، اس امر میں بہت کچھ شک ہے کہ آیا ندوہ سے وہ اغراض پورے بھی ہوتے ہیں یا نہیں، جن کے لیے وہ قائم کیا گیا تھا، کیا وہ دوسرے عربی مدارس کی طرح ایک قدیم طرز کی درسگاہ نہیں ہوگیا ہے؟ میرے خیال میں تو بمقابل لکھنؤ کے اعظم گڑھ میں یادگار شبلی کا قائم ہونا زیادہ موزوں اور مقتضائے مصلحت ہوگا،

مولانا شبلی مرحوم کے خطوط میں تلاش کروں گا، جس قدر دستیاب ہو جائیں گے، بھیج دوں گا

اور میرے خطوط مرحوم کے نام جو آپ کو ملے ہیں، ان کو دیکھے بغیر میں اشاعت کی اجازت نہیں دے سکتا، آپ ان خطوط کی ایک صاف اور واضح نقل روانہ کیجئے تو دیکھنے کے بعد میں کوئی رائے قائم کروں۔

آپ کی مرسلہ کتاب "لغاتِ جدیدہ" پہنچی، جس کے لیے میں مشکور ہوں۔

فقط

سید حسین بلگرامی

۱۸ر جون ۱۹۱۷ء

جناب من

اشتیاق نامہ پہنچا، میں تو مدت سے چاہتا تھا کہ آپ کو خط لکھوں، مگر پتہ ٹھیک معلوم نہیں تھا، رسالہ معارف خصوصاً آخری دو تین پرچے نہایت قابل قدر رہے، اکثر مضامین عالمانہ اور غایت درجہ مفید ہیں، اوائل میں البتہ بعض اوقات مناظرہ کے طور پر کچھ اوائل رسالہ میں درج ہوا کرتا تھا، وہ مجھے پسند نہ تھا، ایسے رسالہ میں جہلاء سے مناظرہ کرنا خلاف شان ہے، رسالہ اس سے بہت برتر ہے،

آپ کی کتاب ارض القرآن کا کیا کہنا ہے، نہایت عمدہ ہے، آپ کی تحقیقات بالکل جدید ہے، فقط افسوس یہ ہے کہ اردو زبان میں مدون ہوئی ہے، جس کا کوئی قدردان مطالعہ کرنے والا بہت کم آپ کو ملے گا، اگر انگریزی میں لکھا جاتا تو یورپ کے لوگ اس کی قدر کرتے اور عربی میں لکھا جاتا تو مصر و عرب میں اسکی قدر ہوتی، میں سو روپیہ سالانہ چندہ آپ کے دار المصنفین کو دیتا ہوں، مگر مجھے کچھ خبر نہیں ہے کہ کس سال کا چندہ میں نے ادا کیا اور کس قدر باقی ہے۔ آپکے دفتر کے طرف سے بر وقت مطالبہ ہونا چاہیے،

سیرۃ نبوی کا بہت انتظار ہے، کب تک چھپ کر شائع ہوگی، اس کی قوم کو بڑی ضرورت ہے، اگر ان کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو جائے تو بہت مناسب ہے،

آجکل دار المصنفین میں کیا کام ہو رہا ہے، یاد رہے کہ انگریزی یا عربی سے ترجمہ ہونا تصنیف نہیں ہے، دار المصنفین میں ایسی ہی تصنیفات ہونی چاہئیں جیسے آپ کی ارض القرآن ہے، کسی کو آمادہ کیجئے کہ اوائل اسلام کے سیاسیات پر محققانہ کتاب لکھے، اہل یورپ کا عام طور پر اعتقاد ہے کہ اسلام دنیا میں بجبر و بزور شمشیر پھیلایا گیا، اس کا دندان شکن جواب دے، علی ہذا القیاس اور بہت سے مضامین ہیں جو مصنفین کے ترجمہ کے لائق ہیں، جو محض انگریزی داں لوگوں کے احاطۂ قدرت سے باہر ہیں

لکھنؤ کے مدرسہ کا کیا حال ہے، ایک وقت میں تو شاید بالکل مولویوں کے قبضہ میں آگیا تھا، اب کیا حال ہے،

میرے پرانے مقالات اور مضامین ایک صاحب جمع کر کے چھاپ رہے ہیں، گو وہ اس قابل نہیں کہ ان کی تجدید کیجائے، نیا کوئی مضمون نہیں ہے جو معارف میں درج ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو، ضعفِ بصارت کی وجہ سے نوشت و خواند کا کام بالکل بند ہے، فقط

سید حسین بلگرامی

۲۸ر جون ۱۹۱۷ء

مکرمی!

اشتیاق نامہ پہنچا، ہم مسلمانوں میں علم مفقود ہوتا جاتا ہے، اور علم کے ساتھ ذوقِ سلیم بھی، میں دو سال پیشتر ہندوستان[۱] گیا تھا، بنارس، لکھنؤ، میرٹھ، دہلی، آگرہ، علی گڈھ تمام شہروں کو دیکھا اور چند روز ہر مقام پر قیام کیا عجیب حالت، افسوسناک حالت دیکھنے میں آئی، جہالت کی تاریکی ہر چار طرف پھیلی ہوئی نظر آئی، فقط چند نوجوان انگریزی خواں نظر آئے جنکو دعویٰ علم کا ہے مگر اصل میں علم ان کا جہل مرکب ہے، ہم مسلمانوں میں بغیر اپنے علوم پر قلیل یا کثیر اطلاع حاصل کیے، انگریزی سے

---

[۱] اس سے مراد شمالی ہند ہے،

چنداں فائدہ نہیں ہوتا، مذاق درست نہیں ہوتا، علمی، مذہبی، سیاسی خیالات بگڑ جاتے ہیں، راہ راست سے ہٹ جاتے ہیں، یہ حالت آجکل عالم گیر ہے، الا ماشاء اللہ

علی گڈھ گزٹ میں ایک مضمون دیکھنے میں آیا "اردو انسائیکلوپیڈیا" پر، اس کے لکھنے والے کون صاحب ہیں، بہت خوب لکھا ہے،

اگر اردو زبان میں انسائیکلوپیڈیا مدون ہوسکے، تو اس سے بہتر کیا ہے، مگر مجھے مشکل معلوم ہوتا ہے، دار المصنفین اگر اس کا بیڑا اٹھائے تو شاید ممکن ہو، مگر جہاں تک مجھے اطلاع ہے ابھی دار المصنفین میں بھی اس قدر کثرت ارکین کی نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ افراد اپنا تمام وقت اس کام کے لیے وقف کردیں،

اگر خدا تعالیٰ چند لوگوں کو جو اس کام کے اہل ہیں، توفیق دے اور وہ اس کی تدوین شروع کردیں تو ان کو ضرور ہوگا کہ کبھی اپنے قدیم اور قومی نقطۂ نظر کو بھولکر فقط انگریزیت نہ اختیار کریں، قدیم اور جدید دونوں طرح کے معلومات سے کام لیں،

مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے مولانا شبلی مرحوم کو اپنا چندہ ایک مرتبہ دیدیا تھا، بہرحال میں اس وقت دو سو روپیہ کا چک ملفوف کرتا ہوں، مجھ غریب پر ان دنوں چندوں کا بار اس قدر ہے کہ مجبوراً قرضداری گوارا کرنا پڑا، کوئی ہفتہ کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرتا کہ کسی نہ کسی طرف سے چندہ کا مطالبہ نہ ہو،

مولانا شبلی مرحوم کا ترجمہ یعنی سوانح عمری کون لکھے گا، یہ ایک ضروری کام ہے، شاید آپ خود اس کو انجام دیں تو بہتر ہوگا، شاید چک کی رقم وصول کرنے میں آپ کو روپیہ سیکڑہ کمیشن دینا پڑیگا اسی لحاظ سے میں نے رقم میں دو روپیہ اضافہ کردیا ہے،

آپ دریافت فرمایئے اگر ایک سال کا چندہ اور میرے ذمہ باقی ہے تو میں وہ بھی متعاقب

ادا کردوں گا، غبن نہ کروں گا،

سیرۃ نبویؐ کی جلد کب تک شائع ہوگی، مجھے اُس کا بڑا انتظار ہے،

آپ کی کتاب ارض القرآن کا ترجمہ انگریزی ہوجائے تو خوب ہوگا، ایسی کتاب یا تو عربی میں شائع ہونا چاہیے یا انگریزی میں اردو بیچاری کو کون پوچھتا ہے، اور محض اردو خواں تو شاید اس کو سمجھ بھی نہ سکیں گے،

سید حسین بلگرامی

چک کا روپیہ بنگال بنک کے کسی شاخ سے وصول کیا جائے تو شاید معوض ایک روپیہ کے آٹھ آنہ سیکڑہ کے حساب سے کمیشن لیا جائیگا، لکھنؤ، دہلی، الہ آباد وغیرہ تمام بڑے شہروں میں شاخیں موجود ہیں،

۱۲ جولائی سنہ ۱۹۱۷ء

مخدومی مکرمی

آپ کا الطاف نامہ پہنچا، میں نے فقط دو سال کا چندہ بھیجا ہے، اگر دریافت سے معلوم ہو کہ ابھی ایک سال کا اور باقی ہے تو میں وہ بھی ادا کردوں گا،

میں نہیں کہہ سکتا کہ معارف کے مضامین کے مطالعہ سے کس قدر خوشی مجھکو ہوتی ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ معارف سے بخوبی ثابت و واضح ہوجاتا ہے کہ انگریزی تعلیم محض بے سود ہے جب تک ہمارے نوجوان لوگ اپنے علوم سے بھی واقف نہ ہوں، یہ میرا پرانا خیال ہے، اور میں اس پر ثابت قدم ہوں کہ ہم مسلمانوں کو ہرگز مناسب نہیں ہے کہ اپنی اولاد کو ابتدا ہی سے انگریزی تعلیم شروع کرادیں، اسی قسم کی خلاف طبیعت تعلیم سے جس قدر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کی کوئی انتہا نہیں، اسلام سے بڑھ کر کوئی عاقلانہ اور قرین فطرت مذہب دنیا میں نہیں ہے، باوجود اس کے ہمارے نوجوانوں کو اس سے

اس قدر سطحی واقفیت ہوتی ہے کہ بعض اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ بھی علی رؤس الاشہاد کہتے پھرتے ہیں کہ اسلام یہود و نصاریٰ کے کتب آسمانی سے ماخوذ ہے،

میرا تو اعتقاد یہ ہے کہ محض انگریزی تعلیم سے خود یورپ کے علوم و مغربی خیالات میں حقیقی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ فقط تقلید سیکھ جاتے ہیں، تحقیق سے بہت دور رہتے ہیں، اگر ندوۃ العلما، کے اصول عملی طور پر رواج پا جائیں تو یہی ایک عمدہ اور مفید قوم ذریعہ تعلیم کا ثابت ہوگا،

آپ کی کتاب انقلاب الامم کس قدر عمدہ اور قابل قدر ہے، مگر میں آپ سے شرط لگا سکتا ہوں کہ اس کو ہمارے نوجوان افراد ہرگز نہ سمجھ سکیں گے، ان کے نزدیک یہ ایک چیستاں سے زیادہ نہ ہوگی، حالانکہ آپ نے کس قدر وضاحت کے ساتھ مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے،

آخر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کتب ذیل میرے نام بذریعہ وی پی روانہ کرا دیجئے،

رسائل شبلی، مقالات شبلی، نالۂ شبلی، کلام شبلی، دیوان حمید، اسباق النحو، دروس الادب، شعر العجم کی فقط جلد چہارم میرے پاس ہے، اول، دوم، سوم جلدیں اگر دستیاب ہو سکیں تو مجھے بھیج دیجئے، کیوں نہیں مولانائے مرحوم کے تمام تصنیفات عربی، فارسی، اردو یکجا جمع کر دیے جائیں تاکہ انکے کلام[1] کا کلیات ہم لوگوں کو مل سکے،

آپ سے اور نیز آپ کے دوسرے مصنفین کی خدمت میں میری ایک استدعا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انگریزی الفاظ کا استعمال بالکل ترک کر دیجئے، الّا درصورت اشد ضرورت، اور مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ لفظ "مسٹر" نہ لکھیے، اگر انگریز لوگ ہم کو مسٹر کہہ کے پکاریں تو پکارنے دیجئے، ہم خود کیوں اپنی زبان سے اپنے ناموں کے ساتھ یہ کریہہ لفظ لگائیں، کیا لفظ صاحب یا مولانا، یا جناب یا اس قسم کے اعزازی الفاظ بس نہیں ہیں،

فقط

سید حسین بلگرامی

عبادی کون صاحب ہیں، مضمون ان کا نہایت عمدہ ہے، بڑے مشکل مسئلہ پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے،

---

[1] مکتوب نگار کو دھوکا ہوا ہے کہ یہ کتاب مولانا عبد السلام صاحب مرحوم کی ترجمہ کردہ ہے، اس سے مراد نثر کا کلیات ہے۔

اور عمدگی سے حل کیا ہے، مخزن نامہ پر آپ کی تنقید میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں،

حیدرآباد دکن
۲۴ اپریل ۱۹۱۶ء

مخدومی مکرمی

الطاف نامہ پہنچا، میں دو سو روپیہ کا چک ملفوف کرتا ہوں، اور اس میں دو روپیہ اضافہ کر دیا ہے، تاکہ کمیشن کا نقصان آپ کی انجمن کو نہ ہو، یہ میرا دو سال کا چندہ ہے، آئندہ جب کبھی چندہ کی رقم وصول طلب ہو تو مجھے مطلع کر دیجئے، تاکہ اس کے ادا ہونے میں تاخیر نہ ہو۔

تفسیر ابی مسلم اصفہانی کا دائرۃ المعارف میں طبع ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے، پھر بھی میں دریافت کروں‌نگا، آپ کا قول "ولست منہم" غلط ہے، خداوند عالم اس سے بھی زیادہ آپ کو خدمات قومی و علمی کی توفیق عطا فرمائے، میں نے جو کچھ اپنے مختصر خط میں لکھا ہے وہ حرف بحرف درست ہے، محض انگریزی دانی سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ نقصان پہنچتا ہے، آپ کے ندوہ نے اسکی اصلاح کر دی ہے،

چک کی رسید سے جلد مطلع فرمائیے،

مولانا حبیب الرحمن صاحب شیروانی یہاں تشریف لائیں گے یا نہیں، ان کا مولانا انوار اللہ صاحب مرحوم کی خدمت پر مقرر ہونا حیدرآباد کی خوش نصیبی ہے، فقط

سید حسین بلگرامی

۵ ستمبر ۱۹۱۶ء

مخدومی مکرمی

سیرۃ النبی کی ایک جلد مجھے پہنچ گئی، مگر آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے ابھی تک اس کا مطالعہ نہیں کر سکا، انشاء اللہ ضرور دیکھوں گا، میں تو اس کا مشتاق مدت سے تھا،

آپکے اشارہ کے بموجب میں نے فوراً علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کو تار دے دیا تھا، اور اس کا جواب بھی ان کی طرف سے نہایت قدر دانی کے الفاظ میں مجھے پہنچ گیا تھا، شاید آپ کو بھی اسکی اطلاع ہو گئی ہوگی،

آپکے دار المصنفین میں اب کیا کام ہو رہا ہے، امید ہے کہ آپ لوگ اسے محض دار المترجمین نہیں بنا دیں گے، مستقل طور پر تصنیف کی زیادہ ضرورت ہے، بمقابلہ ترجمہ کے،

سو روپیہ سالانہ کے حساب سے میرے ذمہ اب کیا باقی ہے، اوائل سال انگریزی میں اگر آپ لوگ اس فقیر سے رقم وصول کر لیا کریں تو بہت مناسب ہے، باقی دار بننا میں پسند نہیں کرتا،

افسوس ہے کہ مولانا حمید الدین صاحب[1] اب یہاں سے بالکل دل برداشتہ ہیں، اور عنقریب چلے جائیں گے،

سیرۃ النبیؐ کی باقی جلدیں کب تک شائع ہوں گی۔ فقط

سید حسین بلگرامی

۹ ستمبر ۱۹۱۹ء

مکرمی!

آپ کا اشفاق نامہ مورخہ ۳۰ ستمبر مجھے کل ملا، میں ایک خط اس کے قبل روانہ کر چکا ہوں، جس میں آپکے پہلے خط کی رسید کے ساتھ کتاب سیرۃ النبیؐ کی بھی رسید درج ہے، مجھے سخت افسوس ہے کہ میں کتاب موصوف یا "مبادی علم انسانی" کے نسبت کوئی رائے نہیں دے سکتا، آنکھوں سے گویا معذور ہوں، مطالعہ کتب سے سخت تکلیف ہوتی ہے، گو کسی حد تک لکھ سکتا ہوں،

سنا ہے کہ سیرۃ النبیؐ پر بہت کچھ لے دے ہو رہی ہے، حسب دستور مسلمان لوگ مولانا مرحوم کی تکفیر پر آمادہ ہیں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں اسکا اثر اس ریاست پر نہ پڑے اور دار المصنفین کو نقصان پہنچ جائے۔

---

[1] مولانا حمید الدین فراہی مرحوم

خالق باری و چیستاں کا نسخہ اس وقت تک میرے پاس نہیں پہنچا، مقدمہ کس کا لکھا ہوا ہے، کیا عجب ہے کہ ان صاحب کا ہو جن کا نام میں نے فرہنگ فارسی رکھا ہے، کیونکہ معمولی خط بھی لکھتے ہیں تو مکتوب الیہ کو برہان قاطع کی ضرورت ہوتی ہے، بعض تحریریں انکی علی گڈھ گزٹ میں آپ کی نظر سے گذری ہونگی۔

سید حسین بلگرامی

۱۵ دسمبر ۱۹۲۱ء
سیف آباد حیدر آباد دکن

جناب من! السّلام علیکم

"رسائل عماد الملک" کے اوراق پریشاں پر جس خوبی اور عمدگی سے آپنے نقد و تبصرہ کیا ہے، اس کیلئے میں مشکور ہوں، رہی میری ذات، اسکو آپکے حسن ظن نے اس حد تک پہنچا دیا جس کا میں اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا، واقعات سے متعلق دو ایک سہو ہو گئے ہیں، جن کی طرف توجہ دلاتا ہوں:۔ وضع مصطلحات کے متعلق جو مضمون رسائل میں شامل کیا گیا ہے وہ ۱۸۷۱ء کے لکھنؤ ٹائمس میں بدفعات شائع ہوا تھا، اور مکمل ہونے کے بعد میں نے اس کو یکجا بصورت رسالہ طبع کرا لیا تھا، خود رسائل میں اس مضمون کے زیر عنوان تشریح کر دی گئی ہے کہ یہ مضمون آج سے پچاس سال قبل لکھا گیا تھا،

میں نے اپنی انگریزی تعلیم چودھویں برس شروع کر کے کل آٹھ سال میں بی اے تک ختم کر دی تھی اور اس طرح بائیس سال کی عمر میں میں اپنی تعلیم سے فراغت حاصل کر چکا تھا،

خط موسومہ سر سید مرحوم کے متعلق آپنے جو کچھ لکھا ہے، اس کے تعلق میں صرف یہ کہونگا کہ آج اگر جناب سر سید مرحوم زندہ ہوتے تو آپ خود ان کے خیالات میں بھی عبرت انگیز انقلاب پاتے۔ واقعات کی تصحیح کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ میرا یہ خط شائع کریں۔

تعلم الیاس قریشی
والسلام خیر ختام
سید حسین بلگرامی عماد الملک

۱۲ر اپریل ۱۹۲۲ء

جناب مخدومی مکرمی زیدت معالیکم

مرحمت نامہ آج پہنچا، میں فوراً دو سو روپیہ کا چک ملفوف کرتا ہوں، مجھے بہت افسوس ہے کہ چندہ کے ارسال میں اس قدر تاخیر ہوئی،

مجھے سخت افسوس ہے کہ جس زمانہ میں آپ یہاں تشریف لائے، مجھے آپ سے ملاقات کا بہت کم موقع ملا، اور آپ کی اقامت کی مدت بھی بہت قلیل تھی، مجھے آپ کی صحبت کا بہت اشتیاق تھا، اور امید تھی کہ اس سے میں فائدہ اٹھاؤں گا،

معارف میں میرے حقیر رسائل کی مختصر تنقید چھپی تھی، اس میں دو چار غلطیاں تھیں، جسے میں نے خواجہ الیاس قریشی کے ذریعہ مدیر صاحب کو مطلع کر دیا تھا، مگر انھوں نے غلطیوں کی اصلاح نہیں کی،

ہم بدنصیب مسلمانوں کی دودست علمی کی وہی حالت ہے جو عراق کی حالت ہے، ہر جگہ اسی طرح کتابیں تلف ہوتی ہیں، یہاں حیدر آباد میں اور نیز اورنگ آباد میں کئی بڑے کتبخانے کس مپرسی کی حالت میں تلف ہوگئے،

کتاب العمدہ فی الجراحات اگر مجھے عنایت کیجئے تو میں نقل کرالوں یا جناب خود اس کی نقل کرادیجئے،

ہمارے ہاں کتاب تنقیح المناظر لاہل البصیرۃ والبصائر، اور کتاب جمہرۃ البلاغۃ کے طبع کرنے کی تیاری ہورہی ہے، ان دونوں کتابوں کے نسخے کہیں جناب کی نظر سے گذرے ہیں، اگر ملاحظہ میں آئے ہیں تو ارشاد کیجئے، کہاں موجود ہیں،

کتاب تنقیح المناظر ابن ہیثم کی کتاب المناظر والمرایا کی بسوط شرح ہے۔

لطف مولے زیادباد

سید حسین بلگرامی

مطبوعات جدیدہ

تعبیر کی غلطی - از وحید الدین خاں صاحب، صفحات ۵۲۰، کتابت وطباعت متوسط، ناشر اسلامی پبلشنگ ہاؤس، ۹ - بدرقہ، اعظم گڈھ۔ قیمت :- ؎

۵۲۰ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں جماعت اسلامی کے "فکر وعمل" اور اس کے "نظریۂ اقامت دین" اور اس کے نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے، کتاب کے مصنف وحید الدین خاں صاحب ایک مدت تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہ چکے ہیں، اور انھوں نے اس موضوع پر متعدد رسالے اور کتابیں بھی لکھی ہیں، مگر ایک طویل مدت کے بعد جب عمر سنجیدگی اور پختگی کے مرحلہ میں داخل ہوئی اور انھوں نے رامپور میں بعض علماء کی راہنمائی میں قرآن وسنت کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا تو ان پر یہ بات واضح ہوئی کہ مولانا مودودی نے "دین" کی جو سیاسی تشریح کی ہے وہ قرآن وحدیث اور اسلاف کے تصور دین سے کچھ ہٹی ہوئی ہے، اسی احساس نے انھیں آخر کار اس کتاب کے لکھنے پر مجبور کیا، وہ لکھتے ہیں:

"قرآن کے مطالعہ کے دوران میں شدت سے مجھ پر یہ احساس طاری ہوا کہ قرآن میرے اس تصور دین کی تصدیق نہیں کرتا جس کو میں ابتک اسلام کا صحیح ترین تصور سمجھ رہا تھا۔" (ص ۲۰)

اس طرح گویا یہ تعبیر اپنے پورے وجود کے ساتھ اسلاف کے تصور دین کے بارے میں ایک قسم کی بے اعتمادی کا اظہار ہے........ میرے لیے یہ احساس ساری دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر لذیذ ہے کہ میری یہ کتاب اسلاف کے اوپر وارد ہونے والے اعتراض کی مدافعت ہے۔" (ص ۹)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی وقتی اور سطحی جذبہ کے تحت نہیں بلکہ اس احساس ذمہ داری

کے ساتھ لکھی گئی ہے جو ہر مومن کی حیات مستعار کا سرمائیہ ناز ہے،

کتاب کے کل ۱۱ ابواب ہیں، اور آخری دو بابوں میں انھوں نے مثبت طور پر صحیح تصور دین پیش کرنے کی کوشش کی ہے،

جہاں تک جماعت اسلامی کے نظریات پر تنقید کا تعلق ہے وہ انتہائی مدلل اور جاندار ہے، لیکن خط وکتابت کی طوالت گفتنی و ناگفتنی، جزئیات کے احاطے اور نتائج کے اخذ کرنے میں لہجہ اور جذبات کی تندی، تیزی اور مبالغہ نمایاں ہے، پھر انھوں نے شدتِ احساس میں بعض اپنے بزرگوں بلکہ اساتذہ سے خطاب میں حفظ مراتب کا پورا لحاظ نہیں کیا ہے،

جماعت اسلامی کے بنیادی عقائد و تصورات تو وہی ہیں جو عام اہل سنت کے ہیں اور ان سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی بعض تشریحات و تعبیرات ضرور ایسی ہیں جو علماء دینی طبقہ کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں، اور جماعت اسلامی سے انکے اختلاف کا اصل سبب یہی تشریحات ہیں، علماء و صلحاء کا یہ اختلاف نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ مسئلہ جماعت اسلامی کے لیے قابل غور ہے، اور اس کتاب نے اس کے لیے اچھا خاصا مواد فراہم کر دیا ہے۔

انوار۔ از مولوی سید محمد ساجد صاحب ندوی، صفحات ۱۷۶، کتابت و طباعت بہتر، پتہ: مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ، سید محمد ساجد ندوی، محمود آباد، سیتاپور، قیمت عہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت ایک مومن کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات ہے، آپ کے چشمۂ فیض سے اہل ایمان ہی سیراب نہیں ہوئے بلکہ آپ کا فیض دنیا کے ہر انسان، ہر ملک اور علم و فن اور تہذیب تک پہنچا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کو محسوس کر کے اس کا اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے، عالم انسانیت پر آپ کے اس فیضہائے بے پایاں کا تقاضا ہے کہ نہ صرف آپ سے ظاہری طور پر محبت کیجائے بلکہ اس کو اپنے سویدائے قلب میں جگہ دیجائے، آپ کی محبت ہی کا یہ ایک تقاضا ہے کہ آپ پر کثرت سے درود وسلام بھیجا جائے، چنانچہ اسلاف نے ہمیشہ اس کو اپنا معمول بنائے رکھا،

سید ساجد صاحب ندوی نے اس کتاب میں درود کے فضائل، اس کے فوائد اور حقوق و آداب پر سیر حاصل بحث کی ہے، یہ کتاب ہر مسلمان کے بار بار مطالعہ کے لائق ہے، شروع میں مولانا مودودی اور مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی تقریظیں بھی شامل ہیں،

موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیۃ (عربی) از مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی، صفحات ۱۰۰، ٹائپ عمدہ، پتہ:۔ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، قیمت عہ

مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی نے اس رسالہ میں ماضی اور حال کی روشنی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عالم اسلام کو موجودہ مغربی تہذیب کے مقابلہ میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، انھوں نے دلائل سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ نہ تو اس تہذیب سے بالکلیہ صرف نظر کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کی اندھی تقلید میں امت اسلامیہ کی فلاح و صلاح ہے، جیسا کہ ترکی اور مصر میں اس کا تجربہ ہو رہا ہے، امت مسلمہ کا عالم انسانیت میں ایک خاص موقف ہے، جس کی خاطر اس کی بعثت ہوئی ہے، اس لیے اسکی اور ساری دنیا کی نجات اسی میں ہے، وہ اس کی حامل بنے، اس حقیقت کو مولانا نے بڑے موثر، متوازن اور مصلحانہ انداز میں مدلل کرنے کی کوشش کی ہے، ان تحریروں کی تاثیر اسوقت اور بڑھ جاتی، اگر مولانا کوئی ٹھوس عملی پروگرام بھی پیش کرتے، اور اس جذبہ کو عملاً پیدا کرنے کے ذرائع کی نشاندہی بھی کرتے، ممکن ہے کہ وہ ابھی ذہن ہموار کر رہے ہوں اور آئندہ کوئی عملی پروگرام پیش کریں۔

آئینۂ تثلیث۔ از کوثر نیازی، صفحات ۲۰۸، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ شہابشاہ عالم مارکیٹ، لاہور، قیمت عہ

پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا، مگر وہاں اسلام کی غربت اسی طرح قائم ہے، جو آزادی سے پہلے تھی، بلکہ اسلامی معاشرہ میں مغربی تہذیب کے فروغ اور دوسرے فتنوں نے ہماری بہت سی دینی قدروں کو پامال کر دیا ہے، انہی فتنوں میں ایک عیسائیت کا فتنہ بھی ہے، افسوس ہے کہ پاکستان

بننے کے بعد اس فتنے میں کمی کیا آتی بلکہ اس میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے جس سے ہمارے دردمند مسلمان فکرمند ہیں، اسی فکرمندی کے نتیجے میں کوثر نیازی صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے، جس میں عیسائیت کے فروغ کے اسباب پر بحث کرنے کے ساتھ خود عیسائیت پر تنقید کی ہے، اور دکھایا ہے کہ یہ فتنہ اسلامی تصورات سے بالکل ٹکراتا ہے، اس لیے جلد سے جلد اس کے استیصال کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

شاد کی کہانی شاد کی زبانی

- مرتبہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی، صفحات ۲۸۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ قیمت :- سعہ

شاد عظیم آبادی اس دور کے مشہور شاعر اور ادیب تھے، انھوں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کو غزل اور مرثیہ گوئی میں خاص امتیاز تھا۔ انکے بہت سے اشعار اردو زبان میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔

اپنی زندگی میں شاد کی دو خواہشیں تھیں ایک یہ کہ ان کا دیوان مرتب ہو کر چھپ جائے، دوسرے یہ کہ انکی سوانح عمری مرتب ہو جائے، ان کی پہلی آرزو انکی زندگی ہی میں پوری ہو گئی، البتہ دوسری آرزو طباعت کے لحاظ سے انکی موت کے بعد پوری ہوئی، یہ انکی خود نوشت سوانح حیات ہے مگر انھوں نے اس میں صیغۂ غائب استعمال کیا ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اسکا مرتب کوئی دوسرا ہے، مرتب نے اس پر جا بجا مفید حاشیے لکھے ہیں، اس کا نام خود شاد نے "کمال عمر" رکھا تھا، مگر مرتب شاگرد نے اسے "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" کر دیا، کتاب دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے، اس سے اس دور کی ذہنیت و معاشرت کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔

اسلامی نظمیں / سنی کے گیت / سنی کا تحفہ

از محمد شفیع الدین صاحب نیر، صفحات ۴۴، ۴۴، ۹۶ کتابت طباعت عمدہ، قیمت ۶۵، ۶۵، عہ پتہ: نیر کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۲۵

بچوں کے شاعر و ادیب کی حیثیت سے محمد شفیع الدین صاحب نیر کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے، انکی کتابیں بچوں میں بہت مقبول ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ بچوں کی نفسیات سے خوب واقف ہیں اور نظم لکھتے وقت بچوں کے جذبات و احساسات اپنے اوپر پورے طور پر طاری کر لیتے ہیں، وہ صحیح معنوں میں بچوں کے شاعر ہیں، اس سے پہلے انکی متعدد کتابوں پر تبصرہ ہو چکا ہے، دوسری کتابوں کی طرح ان کتابوں کی منتخب نظمیں دلچسپ، آسان، رواں اور سبق آموز ہیں، امید ہے کہ انکی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتابیں بھی بچوں میں مقبول ہونگی۔

م۔ ج

دار المصنفین کے تین اہم سلسلے

دار المصنفین اپنے آغاز قیام سے لیکر اس وقت تک مختلف علوم و فنون پر ۹۳ کتابیں شائع کر چکا ہے، ان میں سلسلۂ سیرۃ النبی، سلسلۂ سیر الصحابہ، اور سلسلۂ تاریخ اسلام جن میں سے ہر ایک متعدد جلدوں پر مشتمل ہے، بہت مقبول ہیں، اور ان کے لاتعداد اڈیشن نکل چکے ہیں، سیرۃ النبی کی بعض جلدوں کا ترکی و فارسی و تامل زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے، ان کے علاوہ اور دوسری زبانوں میں ابھی ہو رہا ہے۔

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ

حصۂ اول (ولادت سے فتح مکہ تک) للعہ/
حصۂ دوم (اخلاق و عادات) سے/
حصۂ سوم (معجزات) عہ/
حصۂ چہارم (منصب نبوت) عہ/
حصۂ پنجم (عبادات) سعہ/
حصۂ ششم (اخلاق) للعہ/

سلسلۂ سیر الصحابہ رضؓ

خلفائے راشدین صہ/
مہاجرین جلد اول (عشرہ مبشرہ) سے/
" " دوم (فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام) صہ/
سیر الانصار اول سے/
سیر الانصار دوم للعہ/
سیر الصحابہ جلد ششم (حضرات حسنین کے حالات) للعہ/ ۱۲
سیر الصحابہ جلد ہفتم (فتح مکہ کے بعد کے صحابہ کرام) صہ/
سیر الصحابیات (ازواج و بنات طاہرات وغیرہ کے حالات) سے/
اسوۂ صحابہ (۱) (صحابہ کے عبادات و اخلاق) للعہ/
اسوۂ صحابہ (۲) (صحابہ کے سیاسی و انتظامی کارنامے) ےے/

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام حصہ اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ) سے/
" " دوم (بنی امیہ دمشق) صہ/ ۱۲
" " سوم (خلافت عباسیہ کی تاریخ سفاح سے متقی باللہ تک) سعہ/
" " چہارم (مستعصم باللہ تک عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور اس کے تمدنی کارنامے) سعہ/